خیالِ اقبال

ڈاکٹر طیّب انصاری

اشاعت	بار اول اکتوبر ۱۹۹۳ء
تعداد اشاعت	(۵۰۰) پانچ سو
کتابت	یس یم علی صاحب
طباعت	اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد
سرورق	یس یم علی صاحب
طباعت	ٹیمس بلاکس ۔ چھتہ بازار حیدرآباد
ناشر	ادبی مرکز اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۲

اس کتاب کی اشاعت کے لیے

آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی حیدرآباد کی جزوی مالی اعانت حاصل ہے

ملنے کے پتے

اسٹوڈنٹس بک ہاوس	چار مینار حیدرآباد
حسامی بک ڈپو	چار کمان مچھلی کمان حیدرآباد
سب رس کتاب گھر	پنجہ گٹہ حیدرآباد
مکتبہ رفاہ عام	درگاہ بندہ نوازؒ گلبرگہ
روزنامہ سیاست	جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد

قیمت: ۳۵ روپے

برادرِ بزرگ!

مولوی محمد معین الدین انصاری مرحوم

کے

نام

٥

عبد و مولا در کمینِ یک دگر
ہر دو بیتاب اند، از ذوقِ نظر

٥

بندہ اور خدا ایک دوسرے کی تلاش میں بے چین ہیں
دونوں ایک دوسرے کے مشتاق ہیں۔

٥

—

ترتیب

نئے سال کی دُعا

ہ

"عہد حاضر کو علوم میں اپنی ترقی اور سائنس کی بے نظیر کامیابیاں پر ناز ہے۔ اس میں شک نہیں، اور یہ فخر بجا بھی ہے۔ آج زمان و مکان ختم ہو رہے ہیں، اور انسان اسرار فطرت کو بے نقاب کرنے اور اس کی قوتوں کو اپنے لئے مسخر کرنے میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہا ہے۔ مگر یاد رکھئے! انسان اس زمین پر صرف انسان کا احترام کر کے باقی رہ سکتا ہے۔ اگر تعلیمی قوتوں نے ساری دنیا کے انسانوں میں احترام انسانیت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے زور نہ لگایا تو یہ زمین خون آشام درندوں کی شکارگاہ بن کر رہ جائے گی۔ اس لئے آیئے! ہم نئے سال کو اس دُعا کے ساتھ شروع کریں کہ۔

قادرِ مُطلق ان لوگوں کو جو طاقت اور حکومت کی جگہوں پر متمکن ھیں، انسانیت عطا کرے اور انہیں انسانیت کی پرورش کرنا سکھا دے"

ہ

(علامہ اقبال کا پیام نئے سال نو ۱۹۳۸ء)

بحوالہ محبِ وطن اقبالؔ از سیّد مظفر حسین برنی صہ ۱۲۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک نظر خوش گذر

جب کوئی جواں سال ادیب یا نقاد اپنے فکر کے قبلہ کو ٹھیک کرتا ہے تو ہم جیسے بوڑھے انسان شناسوں کے دل میں خوشی کی لہریں رواں دواں ہوتی ہیں کہ یہ تلاش آدمیوں کی منزلوں میں دوڑ رہا ہے۔

کتاب "خیالات اقبال" اسی انسانی طلب کی امید افزا مثال پیش کرتی ہے۔ صاحب کتاب نے ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ "سب سے بڑھ کر کام احترام آدمیت کے جذبہ کو ابھارنا اور اس کو مربوط حکمت بنانا ہے"

از دل و جان شرفِ صحبت جاناں غرض ایست

ہمہ ایست، وگرنہ دل و جاں، ایں ہمہ نیست

اسی لئے اقبال نے اپنے قاریوں کو چونکا دیا ہے کہ ؎

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ

طیب صاحب نے شاعری کے مختلف معیاروں کیطرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اقبال نے فکر صحیح کو اپنی شاعری کا معیار قرار دیا، اور اسی معیار پر ہم عصر شاعری پر تنقید کیا گیا ہے"

طیب صاحب نے اقبال کے اس نکتہ سنجی پر نظر دلانے کی بار بار کوشش کی ہے کہ ؎

جہانِ تکدہ کا افکارِ تازہ سے ہے نمود

حالی اور اقبال نے اپنے افتقار کے اس ربط کو ظاہر کیا ہے اور یہ اس مضمون کا خاص نکتہ ہے کہ مسدس کی دردمندی اقبال سے شکوہ جواب شکوہ لکھوائی ہے

اقبالؔ کے تصور وطنیت میں تدریجی وسعت کو طیب صاحب نے بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔!

"واقعہ یہی ہے کہ اقبال نے ہمالہ، ترانہ ھندی، نیا شوالہ اور ہندوستانی بچوں کا گیت میں صرف قومی شاعر نہیں ہے بلکہ ان میں بھی وہ حسن فطرت کے شیدائی، حب وطن کے انسانی جذبات کے ترجمان ہیں"

نظریۂ پاکستان پیش کرنے کے مقام کا ترانۂ ملّی سے پہلے نہیں ہے ترانۂ ملّی اس سے بہت پہلے فکر اقبال میں اپنا مقام رکھتا ہے۔ جارحانہ قوم پرستی اور اپنے ہی وطن اور قوم کیلئے عظمتوں اور فائدوں کی گتہ داری کو اقبال وطن دوستی نہیں سمجھتے۔ طیب صاحب نے نکتہ کو واضح کرنے کیلئے اقبال کے اس شعر سے خوب برمحل کام لیا ہے کہ ؎

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے۔
گفتار نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

خود پرست قوم پرستی کی حقیقت اس طرح واضح کی ہے کہ ؎

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

یہ سچ ہے کہ اقبالؔ کی تلاش ہندوستان یا پاکستان میں نہیں بلکہ روح قدس کے ذوق جمال اور کائنات کی وسعتوں میں کرنی چاہیئے۔

خیالات اقبالؔ کے آخری حصے میں جناب طیبؔ انصاری صاحب نے ایک بڑے پتہ کی بات کہی ہے! "مسلم سماج اور مسلم ممالک کے اندر پایا جانیوالا یہ تضاد اسلام کی ترقی اور رواج میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔"

البتہ کہیں کہیں تنقید کی تلخی بقول غالب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ

تلخی سہی کلام میں لیکن نہ اسقدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

اقبال کا رشتہ فکر خیالات اقبال کا ایک اور مضبوط رشتہ پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا ایک بلیغ قول نقل فرمایا ہے۔ جس سے ان قابل تحسین تصورات کا سرا مل جاتا ہے۔

"اقبال نے تمام اردو فارسی شاعری کا رُخ پلٹ دیا ہے۔ یہ اکیلا کارنامہ ہی ملت اور نوع انسانی پر ایک احسان عظیم ہے۔"

طیب صاحب نے اقبال کی محبت اور حکمت کا حالی کی دردمندیوں کے ساتھ جو رشتہ ہے اس کو مضبوط کیا ہے۔ اور ایک فراموش کی جانیوالی کڑی کی اہمیت واضح کی ہے اس پر بار بار زور دیا ہے۔ جاوید اقبال کے ابتدائی فقرے ہی میں اقبال کے اکسیر محبت کی تاثیر کو رگ رگ میں پہونچانے کی کوشش کی ہے۔ نوع انسان کی محبت اقبال کیلئے روح پرور شراب تھی۔ اسی سے وہ جام وسبو کے بغیر مست رہتے تھے۔ خود ہی فرماتے ہیں ؎

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
اسی سے میں نے سیکھا مست بے جام وسبو رہنا

انسان کی یہی محبت اقبال کو بہترین انسان یعنی ذات رسالت تک پہنچاتی ہے جناب طیب صاحب نے اسی عنوان کے ایک مستقل مضمون میں اس نکتہ کو روشن کیا ہے کہ اقبال کو اس ذات کی محبت پر کیسا ناز ہے؟ یہ بھی بتایا ہے کہ اقبال کے کلام کا ایک اہم حصہ اسی عشق محمدی اور اس کی انسانیت نواز عظمت کی منظوم تفسیر ہے۔ اقبال کے سارے فلسفہ اور شاعرانہ حسن طرازی کا جوہر یہی ہے کہ ؎

خودی کی خلوتوں میں مصطفائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی

یہ چند کلمات نہایت مختصر اور تنگ وقت میں لکھے گئے ہیں، کسی تفصیلی تنقید کا یہ محل نہیں ہے۔ پھر بھی یہ عرض ہے کہ خیالات اقبال کا یہ شیرازہ یا گلدستہ تلاش آدم پر ختم ہوتا ہے۔ طیب صاحب نے تلاش آدم میں اقبال کی گہری اور شوخی آمیز جستجو اور اس کی مختلف تعبیروں کو پراثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ خدا کی تخلیق کے مقصود، انسان کی تربیتی تعمیر ہی کو اقبال نے اصلی انسانی جہاد اور سارے نبیوں کے حسین نمونوں کی کشش قرار دیا ہے۔ اس انسان کا کامل نمونہ اقبالؔ کی تلاش کی نظر رحمۃ للعٰلمین ؐ کی شخصیت اور سیرت میں پائی ہے۔ یہیں تلاش آدم کی پیاس بجھتی ہے؎

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمۃ للعالمینؐ انتہا است

اس مضمون میں صاحب قلم نے جگہ جگہ سیرت رحمت ؐ کے پہلوؤں کو کھلے ہوئے روح پرور خوش بوئے اقبال کے رشتہ میں باندھ کر پیش نظر کیا ہے اس کتاب کو پڑھ کر یہی دعا باربار دل سے نکلتی ہے؎

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

رشید

(پروفیسر ڈاکٹر غلام دستگیر رشید)

۲۶/۱۲ ۷۹ء

پیش گفتار

اردو ادب کی دنیا لامحدود ہے اور بے کراں بھی
ابوالکلام آزاد کی شخصیت نثر پر علامہ اقبال کی شخصیت شعر پر محیط ہے
ان دونوں اکابرین ادب کی وجہ سے اردو ادب آبرو مند ہے اور سرخرو
بھی۔ آزاد اور اقبال کا موازنہ دلچسپ اور مفید ہوگا۔ لیکن میں یہاں
ایسی کوئی کوشش نہیں کرونگا۔ تاہم یہاں ایک بات جو کہی جا سکتی ہے، وہ
یہ کہ دونوں کے افکار ایک ہی شجر سے پھوٹتے ہیں۔ میری مراد قرآن حکیم سے
ہے اور دونوں کا رہبر بھی ایک ہی ہے، یہاں میری مراد حضور اکرم صلعم کی
ذات مقدس سے ہے، اور دونوں ہی نے برصغیر ہند کو اپنی جولان گاہ بنایا۔ گو
راہیں جدا جدا اور انداز کار مختلف تھے، لیکن دونوں ہی کے پیش نظر برصغیر
کے مسلمانوں کا سیاسی اور مذہبی تحفظ تھا۔ اس طرح دونوں کی شخصیتیں،
ہماری قومی زندگی میں رہبر و رہنما تھیں۔ جہاں افراد کی زندگیوں پر ہر دو مفکرین
سے اثر پذیر رہی ہے۔

ابتدائی عمر میں مولانا آزاد راست طور پر اثر انداز ہوئے۔ غبار
خاطر نے کتنوں کو متاثر نہیں کیا ہے۔ ایک زمانہ معترف ہے۔ پھر ان کے
سیاسی افکار اور مذہبی خیالات مختلف خطبوں اور مضمونوں کے ذریعہ
سے میرے ذہن و قلب پر اثر چھوڑتے رہے ہیں۔ علامہ اقبال کا معاملہ
دوسرا ہے۔ طارق کی کتاب "جہان اقبال" میری رہنما بنی ہے
جب سن شعور کو پہنچا تو ڈاکٹر یوسف حسین میرے مفسر بھی تھے اور مبصر بھی۔
"روح اقبال" کو میں اقبالیات میں غیر معمولی اضافہ سمجھتا ہوں۔ کلام
اقبال اسی تصنیف کی مدد سے میری روح میں حلول کر گیا۔ اقبال اب میرا

پیسہ روئی تھا۔ ابتدائی عمر میں اکثر میں نے اپنے بڑے بھائی جناب محی الدین انصاری ایڈوکیٹ کو۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

گنگناتے سنا ہے۔ اصل میں ان کا تعلق جامعہ عثمانیہ کی اس نسل سے ہے جس نے سیاسی اعتبار سے اقبال کے افکار کو ذہنی اور قلبی طور پر قبول کر لیا تھا۔ اقبال برصغیر کے شاعر تھے۔ لیکن حیدرآباد کو یوں اہمیت حاصل ہے کہ افکار اقبال کی گونج سب سے پہلے یہیں سنائی دی، اور اقبال کو باضابطہ طور پر سمجھنے کی کوشش بھی یہیں ہوئی۔ چنانچہ ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو باغ عامہ حیدرآباد میں شاندار پیمانے پر "یوم اقبال" منایا گیا۔ اس کے بعد نواب حسن یار جنگ کی کوششوں سے بزم اقبال کا قیام عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں قابل ذکر کارنامہ نواب بہادر یار جنگ کا ہے۔ جن کے بارے میں یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اقبال کے تصوراتی مرد مومن کی حقیقی اور جیتی جاگتی تعبیر و تعبیر تھے۔ ان کی دیوڑھی واقع بیگم بازار میں ہفتہ وار "درس اقبال" ہوا کرتا تھا۔ جس میں ماہرین اقبال درس دیا کرتے تھے۔ جن مفسرین اقبال نے ان محفلوں میں شرکت کی ہے ان میں جناب ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کی ذات باقیات الصالحات میں سے تھی۔ سنہ (۱۹۳۸ تا ۱۹۴۸ء) ان دس سالوں میں حیدرآباد کی فضا اقبال کے ترانوں سے گونجتی رہی ہے۔ اس دور میں اقبال فہمی کی جو کوششیں رہی ہیں علمی و ادبی سطح پر وہ ہر آئینہ قابل ذکر ہیں۔

نظر حیدرآبادی نے اپنی تصنیف "اقبال اور حیدرآباد" میں

اُن تمام کوششوں کا ذکر موثر انداز میں کیا ہے جن کے ذریعے اہلِ حیدرآباد نے اقبال کو اپنا "پیرِ رومی" بنا لیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں "میخانۂ اقبال سے سبھی نے بقدرِ ظرف اپنے اپنے پیمانے بھرے ہیں، پی ہے منہ ڈھالی ہے اور ایک عالم کو اس سرور سرمدی سے آشنا کیا ہے، جو اقبال کی روح میں موجزن رہا ہے۔ ان روشن ضمیر قدح خواروں کے سامان کیف و سرود پر نظر ڈالنے سے یہ محسوس سا یہ ہوتا ہے کہ سبھوں نے اقبال کی زبان اقبال سے یہی التجا کی ہے کہ

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی"

عشق و جنون کے اس دھچے میں خرد کی جو مشعلیں جلی ہیں ان کی تعداد بقول نظر ۲۳ ہے۔ ان میں قابلِ ذکر روحِ اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین) اقبال کا تصور زمان و مکان (ڈاکٹر رضی الدین صدیقی) مقامِ اقبال (اشفاق حسین) آثارِ اقبال (دستگیر رشید) رموزِ اقبال (ڈاکٹر میر ولی الدین) فکرِ اقبال (خلیفہ عبدالحکیم) اقبال ایک جدید تشکیل (عزیز احمد) اور حکمتِ اقبال (دستگیر رشید) ہیں نظر نے جن اقبالی نوجوانوں کا اپنی تصنیف میں ذکر کیا ہے ان میں ڈاکٹر محی الدین زورؔ، اکبر وفاقانی، سکندر علی وجدؔ، مخدوم محی الدین، میکش بدر شکیب، آرام، رشدی، اشک، امیر، باقی، رشید اور وفا آگے چل کر نامور ہوئے۔ جامعہ کے قیام سے قبل بھی اقبال کا اثر اہلِ حیدرآباد پر رہا ہے۔ جن شاعروں نے اس زمانے میں اثر قبول کیا ان میں عظمت اللہ خاں علی منظور، تمکین سرمست، طاہر علی خاں مسلم افضل الرحمٰن، توفیق، کیفی، امجد اور علی اختر نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ اقبال فہمی کے سلسلے میں حیدرآباد کا خصوصی ذکر اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ یہاں اقبال کی

نہ صرف عوامی سطح پر قدر افزائی ہوئی بلکہ اقبال کو سمجھنے کی سنجیدہ کوششیں بھی کی گئیں، اور اقبال کو واقعی ایک قومی مفکر کی حیثیت اسی شہر میں ہوئی ہے۔ آگے چلکر حیدرآباد کی تقلید میں ملک کے دوسرے علاقوں کے لوگوں نے اقبال کو سمجھنے اور اس کے کلام سے مستفید ہونے کی کوشش کی ہے۔ تاہم میں وثوق سے کہونگا کہ اقبال فہمی کی ہمہ گیر کوششوں کے نتیجہ میں اقبال پر ایسی کتاب اب تک نہیں لکھی گئی ہے۔ جیسی کہ حیدرآباد میں ڈاکٹر یوسف حسین نے روح اقبال کے نام سے لکھی تھی۔ خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے بعد کو مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن ان تصانیف میں روح اقبال والی بات کہاں ہے۔

۱۹۷۷ء میں اقبال صدی منائی گئی، اس کے نتیجہ میں اقبال سے متعلق بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اقبال کو سمجھنے کیلئے جلسوں کا اہتمام ہوا، لیکن میرے خیال میں وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا جو کلام اقبال کا تقاضہ ہے علمی اور ادبی اعتبار سے اقبال کے بارے میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی لکھا گیا۔ چونکہ ان تحریروں کا تعلق محض ذہن سے ہے۔ اس لئے کلام اقبال قلب انسانی پر اثر انداز نہ ہو سکا، اور اگر نہیں ہوا ہے تو کچھ نہیں ہوا۔ کیونکہ اقبال کا مقصد قلوب کو گرمانا تھا! قاری کے قلب و ذہن میں فکر کے چراغ فروزاں کرنا تھا! قوائے جسمانی میں حرکت و حرارت پیدا کرنا تھا، اور اس سے بڑھکر احترام آدمیت کے جذبہ کو عام کرنا تھا۔ یہ نہیں ہوا، اور اس کے علاوہ سب کچھ ہوا تو میرے نزدیک کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔

اقبال فہمی سے متعلق جو کتابیں آئیں اُن کی ایک ڈھیر سی لگ گئی ہے ان میں سے چند کا میں یہاں ذکر کروں گا، سرسری! اقبال کے متعلق ترقی پسندوں کا رویہ ابتداً معاندانہ اور مخالفانہ تھا، اسی رویہ کو برقرار

دیکھتے ہوئے، مجنوں اور اختر رائے پوری نے اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی، اور اقبال کو رجعت پسند، فرقہ پرست، ماضی پرست اور فاشسٹ اور جانے کیا کچھ لکھ دیا تھا، لیکن آگے چل کر اسی قبیل کے شاعر اور نقاد سردار جعفری نے اقبال شناسی لکھ کر تلافی کردی ہے۔ سردار نے کہیں زیادہ صحیح اندازِ فکر اختیار کیا ہے اور اقبال کو سمجھنے کی مثبت کوشش کی ہے۔ رشید احمد صدیقی، مولانا صلاح الدین احمد، وقار عظیم، عبدالمجید سالک ڈاکٹر سید عبداللہ، محمد فرمان فتحپوری، اور ابو محمد مصلح نے اقبالیات کے مختلف عنوانوں پر قلم اٹھایا ہے "اس صدی" کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جگن ناتھ آزاد ماہر اقبال بن کر ابھرے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ آزاد کو اقبال کا قرب حاصل رہا اور انہوں نے ذہنی طور پر اقبال کے افکار کو قبول بھی کیا ہے۔

اس بیچ سلیم چشتی کی حیثیت صرف اس مفسر کی ہے جو کلام اقبال کی شرحیں لکھنے پر اکتفا کرتا ہے۔ جہاں تک ڈاکٹر عبداللہ، رشید احمد صدیقی سردار جعفری اور وقار عظیم جیسے ناقدین ادب کا تعلق ہے، وہ اقبال پر ایسا ہی قلم اٹھائیں گے جیسا کہ وہ غالب اور میر کے تعلق سے لکھ چکے ہیں۔ حالانکہ ان شعرا میں اور اقبال میں بعد المشرقین ہے، اس لئے ان کی تحریریں قابل اعتنا نہیں ہیں۔ مجھے اس وقت زیادہ دکھ ہوا جب ڈاکٹر یوسف حسین جیسا شیدائی اقبال بھی غالب اور آہنگ غالب پر قلم اٹھاتا ہے تو وہی انداز اختیار کرتا ہے جو اس نے روح اقبال میں اختیار کیا تھا۔ غالب کی

فنی حیثیت کا میں منکر نہیں ہوں، لیکن فکری سطح پر اقبالؔ سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ یہ بھی شاید اس "صدی" کا کرشمہ ہے۔ البتہ ظ انصاری کا انداز فکر کچھ اچھوتا اور تیکھا ہے اور انہوں نے اشتراکی روسی میں بیٹھ کر اقبالؔ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

میں اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ میری کوشش سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ اقبالؔ کو ابھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اقبال کو حالات حاضرہ کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اقبال محض شاعر ہی نہیں تھے وہ مفکّر تھے اور دانشور بھی۔ انہوں نے اپنی فکر قرآن سے حاصل کی ہے۔ وہ اسلام کے حامی ہیں۔ اسلئے وہ تنگ نظر نہیں وسیع النظر شاعر ہیں۔ اسلام انسانیت کا نجات دہندہ ہے۔ یہ ایک عالمی راستہ ہے جس پر عمل کر تمام انسان فلاح کی منزل کو پاتے ہیں۔ وہ رشتہ اخوت میں جڑ جاتے ہیں۔ رنگ و نسل کے سارے تفرقے مٹ جاتے ہیں۔ جغرافیائی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں۔ ساری کوششیں یہی رہی ہیں، ازل سے کہ انسان، انسان کو پہچانے، باوجود خلوص دل کے آج تک ایسا نہیں ہو سکا ہے۔ مگر ایسا ہو کیسا سکتا ہے؟ تاوقتیکہ ہم اسلام کو انسانی ضرورت نہ سمجھیں اور صدق دل سے اس پر عمل نہ کریں۔ اس وقت تک تمام انسان ایک دوسرے سے قریب نہیں آسکتے، اور محبت کا جذبہ پروان نہیں چڑھ سکتا۔ مذہب اسلام کو محض دوسرے مذاہب کیطرح جان لینا اور کسی مخصوص طبقہ کا مذہب سمجھنا کوتاہ نظری ہے۔ اقبالؔ نے صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے تشخص یا ان کی انفرادیت کو باقی رکھنے کے لئے شعر نہیں کہے ہیں بلکہ یہ ایک پیام ہے نوع انسانی کے لئے۔ اور یہ

ہند و پاک کے تمام انسان دوستوں کا فریضہ ہے کہ وہ کلام اقبال کی روشنی میں اس عالمی و ہمہ گیر نظریۂ حیات کو دنیا کے تمام باشندوں تک پہنچائیں۔ دراصل یہی کلام اقبالؒ کا بنیادی مقصد ہے۔

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

○

میں شکر گذار ہوں استادِ گرامی ڈاکٹر غلام دستگیر رشیدؔ صاحب مرحوم کا کہ انہوں نے اس کتاب کا پیش لفظ آج سے تقریباً چودہ سال قبل لکھا جب وہ گلبرگہ تشریف لائے تھے

استاد محترم رشیدؔ صاحب کا انتقال ۲۵ اپریل ۱۹۹۲ء کی شب ہوا، اور تدفین مسجد قطب شاہی خیرت آباد (حیدرآباد) کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشیدؔ ایسا ماہر اقبال شاذ ہی اب پیدا ہو۔ اللہ تبارک تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر طیّب انصاری

۲۰ اپریل ۱۹۹۳ء م ۲۷ شوال ۱۴۱۳ھ

المنیہ
10-3-5/6/1
مہدی پٹنم۔ حیدرآباد (اے پی)
500028

رشتۂ فکر

پروفیسر میکنزی نے پیغمبر اور شاعر سے متعلق ایک بلیغ بات
کہی ہے۔ عصرِ حاضر کے مسائل، دشواریوں اور مصائب کے پیشِ نظر انہوں نے کہا
تھا کہ ہمیں عہدِ نو کے شاعر کی ضرورت ہے یا ایک ایسے شخص کا وجود ہمارے لئے
مفید ثابت ہوگا جو شاعری اور پیغمبری کے دوگانہ صفات سے متصف ہو...
ہم ابھی ایک ایسے شاعر کے منتظر ہیں جو وضاحت کے ساتھ پیکرِ انسانی میں
صفاتِ الٰہی کے جلوے دکھائے۔ " شاید یہی وجہ تھی کہ ہائینے نے خود کو
"روح القدس کا سپاہی" اور اقبال نے شاعری کو پیغمبری کا جزو قرار دیا تھا۔
اقبال کو احساس تھا کہ وہ فن، وہ ہنر جس کا مطمعِ نظر اخلاقِ الٰہی کو اپنے اندر
جذب کرنا (تخلقوا باخلاقِ اللہ) ہے دراصل انسان کے اندر ایک غیر محدود
طلب پیدا کرتا ہے، اور انجام کار اسے اس زمین پر اللہ کی خلافت کا مستحق ٹھہراتا
ہے"۔ اقبال نے اپنے قول کے ذریعے جہاں شاعر کے مرتبہ کا تعین کیا ہے۔
وہیں اس صداقت کو بھی واضح کیا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے شاعری کی کیا
اہمیت ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام شاعری کی اجازت نہیں دیتا۔ حالانکہ
ایسا نہیں ہے۔ بانیٔ اسلامؐ نے یقیناً امرؤ القیس کو ان شعرار کا سردار قرار
دیا تھا جو جہنم میں ہانک دیئے جائیں گے، لیکن معنی و صورت کی پاکیزگی اور طہارت
شعرِ عنترہ کو سن کر آپ محظوظ بھی ہوئے تھے۔ ایک دفعہ قبیلہ بنو عبس کے
مشہور شاعر عنترہ کا شعر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا جس
کا مطلب ہے " میں بہت سی راتیں محنت و مشقت سے بسر کی ہیں تاکہ اکلِ
حلال کے قابل ہو سکوں"۔ اس شعر کو سن کر آپؐ اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم
اجمعین سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ " کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس

سے شوق ملاقات نہیں پیدا کیا، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگار ندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔" (مضامین اقبال ص۔۔) اس واقعہ نے شاعری کی نئی جہت اور نئے رُخ کا تعین کیا ہے۔

اقبال دیدہ و بینا شاعر تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا نظر عمیق تھی۔ علوم دینی اور دُنیوی میں ید طولیٰ رکھتے اور فلسفہ کے عالم تھے۔ عالمی سیاست کے پیچ و خم سے واقف اور محرم راز درون میخانہ تھے اس لئے انہوں نے اپنی شاعری کی باگ امراء القیس کی نہیں عنترہ کی راہ کی طرف موڑی اور اپنی شاعری کو جزو پیغمبری بنایا۔ میکنزی کو جس شاعر کا انتظار تھا، اقبال کی صورت میں وہ شاعر مل گیا۔ یہ اردو اور فارسی کی خوش بختی ہے کہ اقبال ترسیل فکر اور ابلاغ خیال کے لئے ان زبانوں کا انتخاب کیا۔ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم اقبال کے اولین مخاطب ہیں، ورنہ اقبال کا پیام عالمی، آفاقی اور ابدی ہے۔

ناقدین اقبال نے فکر و خیال کے ڈانڈوں کو اردو، فارسی اور انگریزی کے مختلف شاعروں سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ اور فلسفہ کی دنیا میں مختلف مکاتیب سے ان کا رشتہ جوڑا ہے۔ اقبال اپنی طرز کے منفرد شاعر تھے۔ فکر و خیال کے اپنے مکتب کے وہی بانی بھی ہیں اور پیرو بھی۔ یہ بات الگ ہے کہ ابتدائی دور میں اقبال نے اردو فارسی اور انگریزی کے بے شمار شعراء اور مفکرین سے اثر قبول کیا ہے۔ لیکن اس اثر کے نتیجہ میں یہ کہنا کہ فلاں شاعر پیدا نہ ہوتا تو اقبال پیدا نہ ہوتے ناقدین کا اپنا انداز فکر ہے۔ اقبال تو عہد نو کے اس تقاضے کے نتیجہ میں پیدا ہوئے جس کا اظہار میکنزی نے کیا تھا، اور میکنزی کے الفاظ میں اقبال میں شاعری اور پیغمبری کی دوگانہ صفات موجود تھیں اور ان کا شمار ان نہر وران شعر میں ہوتا ہے جو نوع انسانی کو رحمت الٰہی سے ہمکنار کرتے ہیں

ان کا ربط اپنے ماحول حیات کے ساتھ ع یا زمانہ ستیز کا ہوتا ہے۔ اقبال ایسا بلند مرتبت شاعر صبغتہ اللہ (الٰہی رنگ) میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنی روح میں وہ زمانہ کی حقیقت وابدیت کو محسوس کرتا ہے ؎

اقبال کی ذہنی تربیت اور نشو ونما میں اردو کے جس شاعر کا نام سب سے پہلے لیا گیا، وہ غالب ہے۔ بانگ درا کے دیباچہ میں سر عبدالقادر نے یہ لکھ کر کہ مرزا اسد اللہ خاں کو اردو و فارسی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے اس کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا، اور مجبور کیا کہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے، اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا" اپنے تئیں سمجھا ہوگا کہ انہوں نے کوئی غیر معمولی بات کہی ہے یا۔ اور شائد اقبال بھی چونکہ ابھی اقبال سے آگاہ نہ تھے، اس جملے کو پڑھ کر مسرور ہوئے ہونگے۔ بعض ناقدین اقبالیات نے اسی شاعرانہ خیال کے پیش نظر غالب کو اقبال کا "پیر" ثابت کرنیکی کوشش کی ہے۔ چنانچہ پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد نے لکھا ہے کہ " گو کہنے کو داغ سے تلمیذ تھا، لیکن معنوی و ذہنی حیثیت سے غالب کے شاگرد تھے۔ اقبال کی شاعری گویا غالب کی شاعری کا تتمہ ہے۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

مجنوں گورکھپوری نے غالب اور اقبال کے رشتۂ فکر کی بڑے اچھے انداز میں وضاحت کی ہے" اقبال اردو کا پہلا شاعر ہے، جو مفکر بھی ہے اور صاحب پیغام بھی۔ اردو شاعری میں فکر وفن کے میلان کی ابتداء غالب سے ہوتی ہے۔ لیکن غالب غزل گو شاعر تھے، اس لئے ان کا کوئی مدلل

اور منضبط فلسفہ رہا بھی تو وہ اس کو ربط اور تسلسل کے ساتھ پیش نہ کر سکتے تھے۔ ان کی غزلوں کے اشعار میں جابجا ان کا مفکرانہ انداز ظاہر ہوتا ہے، اور ہم کو نئے نئے فکر انگیز اشارے ملتے ہیں۔ ان کو خود احساس تھا کہ تنگنائے غزل اُن کے حوصلۂ فکر کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ اردو شاعری میں اقبال ہی ہستی ہیں جن کو صحیح معنی میں مفکر کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری کی بنیاد ایک خاص نظام IDEOLOGY پر ہے۔ ان کے خیالات میں ترتیب و تسلسل اور استدلال و نتیجہ نظر آتا ہے اور اُن کے اسلوب میں بھی ایک ربط اور ضابطہ ہوتا ہے" اقبال کو خود بھی پیشرو غزل گو شعراء کی محدودیت ... کم مائیگی کا احساس تھا۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیّل ان کا

اُن کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کا مزار

اقبال دبستان داغ کے ممتاز فرد ہیں۔ ابتداء میں اقبال نے داغ سے اصلاح لی ہے اور اس کا اعتراف اقبال نے کیا ہے اور اسی طرح اقبال نے غالب سے بھی استفادہ کیا ہے، لیکن ذہنی طور پر وہ حالی سے متاثر رہے ہیں۔

مشہور زمانے میں ہے نام حالی

معمور مئے حق سے ہے جام حالی

میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا

نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی

بقول مجنوں اردو "نظم و نثر میں حالی اور آزاد نے جو تحریک چھیڑی تھی اقبال نے اس کی تکمیل کی"۔

حامد حسن نے ڈرائڈن کے اس قول کو دہرایا ہے کہ "تین زبانوں

ہیں تین شاعر یونان، اٹلی، اور انگلستان میں پیدا ہوئے۔ پہلا رفعت تخیل میں سبقت لے گیا، دوسرا شان و شوکت میں اور آخری دونوں میں۔ قدرت اس میں اضافہ نہیں کر سکتی تھی، اسلئے تیسرے کو بنانے کیلئے اس نے پہلے دونوں کو ایک ذات میں جمع کر دیا۔" یہاں ان کی مراد میر، غالب اور اقبال سے ہے، حالانکہ میر اور غالب ذہنی اعتبار سے اقبال سے مختلف شاعر ہیں۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم "ہمارے غزل گویوں میں میر تقی میر بڑا استاد گذرا ہے، اور اکثر بڑے بڑے شعراء نے اُسے داد دی ہے۔ میر کے نشتر بہتر ہوں یا بہتر سب میں ایک شکست خوردہ اور انفعالی کیفیت ہے۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

غالب کے ظلمت کدے میں بھی شب غم کا ہی جوش ہے۔ شمع جو دلیل سحر ہے وہ بھی خاموش ہے! اس ظلمت کی وجہ سے دن اور رات یکساں ہو گئے ہیں۔

چوں صبح من ز سیاہی بہ شام مانند است
چہ گوئمت کہ ز شب چند رفت و تا چند است

اور ٹینی سن کا قول دہراتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کے بارے میں لکھا ہے کہ "اقبال نے اردو اور فارسی شاعری کا رُخ پلٹ دیا اور یہ ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اگر اس نے حکمت کے بیش بہا موتی اپنے کلام میں نہ بھی بکھیرے ہوتے تو بھی یہ اکیلا کارنامہ اپنی ملت اور نوع انسان پر ایک بڑا احسان ہوتا۔ اچھا ہنر وہ ہے جس سے بقول ٹینی سن ملتوں کے قلب استوار ہوں اور جو قوموں کا رُخ انحطاط سے عروج کیطرف پلٹ دے" اور اقبال نے یہ کام حالی سے اثر قبول کرنے کے بعد انجام دیا۔ اقبال کے ذہنی نشو و نما اور

اور پرداخت میں جس فکر نے حصہ لیا ہے، وہ فکرِ حالی ہے۔ جو انسانی دردمندی سے عبارت ہے۔ اس لئے یہ کہنا محض ایک خیال ہے کہ "اگر غالبؔ پیدا نہ ہوتے تو اقبال پیدا نہ ہوتے"

شعر معنی اور صورت جیسے دو عناصر ترکیبی سے عبارت ہے۔ اگر اقبالؔ پر غالبؔ کا کوئی احسان ہے تو یہ کہ غالبؔ کے اثر نے ان کی شاعری کو اُبالی کھچڑی بننے سے بچا لیا۔ لفظی پیکر تراشی، میں وہ داغؔ اور غالب سے قریب ہیں، جب کہ ذہنی و فکری نشو نما میں انہیں حالیؔ، آزادؔ اور شبلیؔ نے زیادہ متاثر کیا ہے۔

اقبالؔ ابھی مفکر تھے نہ فلسفی، وہ ابھی محرم رازِ درونِ مے خانہ بھی نہ تھے۔ اُن کی ذات اس پرندہ کی سی تھی، جو آب و دانہ کی تلاش میں قریہ قریہ اور جنگل جنگل بھٹکتا پھرتا ہے، در در کی خاک چھانتا ہے اور اسی تلاش اور جستجو میں صبح شام میں بدل جاتی ہے، اسی تگ و دو نے انہیں اردو اور فارسی کے علاوہ جرمن اور انگلش ادب سے قریب کیا۔ رومیؔ تو اقبالؔ کے پیر تھے۔ انگریزی ادب کے مطالعہ نے اقبال کو نئی فضا اور نئے ماحول سے آشنا کیا تھا۔ وہ مغربی فکر سے متاثر تھے۔ مغربی جرمنی کے قیام نے علمی جواہرات سے اُن کا دامن بھر دیا تھا۔ مارکس و لینن قریب ہوئے تھے۔ عجمیؔ لئے اقبال کی شاعری کو رنگینی عطا کر چکی تھی۔ مغربی تعلیم نے گہرائی عطا کی۔ ہندو فلسفہ سے اقبالؔ فطری لگاؤ رکھتے تھے۔ گوتم، رام، اور گورو نانک کی انسانیت نے اقبال کی فکر کو نیا انداز عطا کیا تھا۔ لیکن ابھی اقبال کی تشکیل پوری ہو نہ پائی تھی ؂

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؔ نہ صاحبِ کشّاف

اقبال خیر البشرؐ کے حضور جبیں سائی کرتے ہیں ۹

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!!

پھر حیات کے اسرار کھلتے ہیں تب کہیں جا کر اقبال، اقبالؔ سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ۹۰

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصد فقط ملت آدم

پیغمبر اسلامؐ کی ذات با برکات اقبالؔ کیلئے نمونہ تھی۔ اقبالؔ نے عشق و عقل، خودی و بے خودی اور مرد مومن کا جو تصور پیش کیا ہے وہ تمام کا تمام اسی کا فیض ہے۔ اقبال کی شاعری قرآن کی تفسیر اور حضور اکرمؐ کا نطق بن گئی۔ میری رائے میں اقبال کے رشتۂ فکر کو تلاش کرنے کے لئے جہاں ہمیں غالبؔ، میرؔ اور داغؔ کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہیں آزادؔ، شبلیؔ اور حالی کو بھی پڑھنا ہوگا۔ بلاشبہ ہندو فلسفہ، فارسی شاعری، اردو اور مغربی تعلیم نے درجۂ کمال تک پہنچایا، لیکن اقبالؔ کی تشکیل اور تعمیر میں اسلامی فکر نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ وہ عشق رسولؐ تھا، جس نے ان کے اندر احترام آدم کے تصور کو ابھارا! اور بالآخر کلام شیریں کی صورت میں اقبالؔ کو ابدی، لافانی اور آفاقی زندگی عطا کی۔ اس سلسلے میں حالیؔ معلم اوّل ہیں اور اقبال کا رشتۂ فکر انہیں کے در سے پیوستہ ہے۔

٭

مقصدِ شعر

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡكُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡكُمۡ اٰیٰتِیۡ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۲۵

پرویزؔ نے شعلۂ مستور میں حضرات انبیائے کرام کے منصب سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ان پیغامات خداوندی کو لوگوں تک پہنچاتے ہی نہیں بلکہ ان کا فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کریں۔ یعنی ایک ایسا نظام قائم کریں، جن میں تمام امور کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق ہوں۔ یہ نظام اس جماعت کے ہاتھوں وجود پذیر ہوتا ہے، جو بطیب خاطر قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں" اقبالؔ نے اگر شاعری کو جزو ایست از پیغمبری کہا ہے تو اس سے ان کا منشا قانون خداوندی کے مطابق فرد کی بھی اور افراد کی تعمیر عالمی سطح پر ایک صحت مند اور صالح معاشرہ کی تشکیل ہے۔ اقبالؔ ان معنوں میں پیدائشی مسلمان تھے۔ انہوں نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا تھا، گو ان کے اجداد برہمن سہی، لیکن اقبالؔ ذہنی اور قلبی طور پر بھی مسلمان تھے۔ ان معنوں میں کہ انہوں نے ذہن و قلب کی وسعتوں میں اسلام کو سمو لیا تھا، اور صمیم قلب سے اس بات پر کامل یقین رکھتے تھے کہ بلاشبہ الدین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ ۟

اسی یقین کامل کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن کو قوانین الٰہی کی نشر و اشاعت کے لئے برتا اور اسلامی تعلیمات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اقبال کی شاعری ان کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ محض فیشن کے طور پر انہوں نے اسلامی افکار کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ اگر ہم شاعری سے متعلق اقبالؔ کے مضامین کا مطالعہ کریں تو اس کی تصدیق ہو جائیگی۔ اقبالؔ کے پیش نظر

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بھی تھی، جس میں انہوں نے امرأ القیس کو عظیم شاعر تسلیم کرنے کے باوجود ان شاعروں کا رہبر قرار دیا تھا جو جہنم میں جانے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اقبالؔ نے شعر گوئی کے فن کو اختیار کیا ہے تو پوری ذمہ داری اور مکمل شعور کے ساتھ ہی کیا ہے، اور پیغمبر اسلامؐ کے قول کی روشنی میں جہاں ہمیں کلام اقبال کا تجزیہ کرنا ہے وہیں اقبال کی اس شاعری سے وہی کام لینا ہے جو خود اقبالؔ کا منشا تھا یعنی افراد اور جماعتوں کے کردار کی تعمیر اور عالمی بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل۔ چنانچہ اقبال نے خود بھی بارہا اپنے شاعر نہ ہونے کا اقرار کیا ہے اور قاری کو مجبور کیا ہے کہ اُن کی نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھیں۔ اقبالؔ کو اس وجہ سے بھی اصرار تھا کہ اس دور میں جس قسم کی شاعری تھی (وہ سلسلہ آج بھی جاری ہے) وہ سراسر امراؤالقیس کی شاعری تھی یا ہے۔ چنانچہ حالیؔ نے جو علم بغاوت بلند کیا تھا، اس کا پس منظر بھی یہی ہے۔

اقبالؔ نے فکر صحیح کو اپنی شاعری کا معیار قرار دیا [illegible] اسی معیار پر ہم عصر شاعری کی تنقید بھی کی ہے۔ وہ آج کے نقادوں کیطرح غالبؔ کی شاعری پر واہ واہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں میری مراد ان نقادوں سے ہے، جنہوں نے غالبؔ صدی میں پیسہ بٹورا، اور غالبؔ پر بے شمار تنقیدی کتابیں لکھ ڈالیں، اور جب اقبالؔ کا نمبر آیا تو اقبالیات کے مختلف پہلوں کو اپنی دانست میں اُجاگر کیا اور ماہر اقبالیات کہلائے۔ اصل میں یہ پیشہ ور نقاد ہیں جن کا نہ تو کوئی نقطۂ نظر ہے اور نہ ضمیر۔ ورنہ وہ اس طرح کی تضاد خیالی کا کبھی شکار نہ ہوتے۔ اگر میں نے غالبؔ کو یگانۂ فن کہا ہے اور کہا ہے کہ اس نے لفظوں کے سہارے حسین تاج محل تراشے ہیں، تو اس سے مراد

غالب کے فن کی تعریف کرتا ہے، فکر کی نہیں، اور جب اقبال کی عظمت کو
تسلیم کرتا ہوں تو، اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اقبال کا فن اور فکر دونوں
ہی معیاری قرار پاتے ہیں۔ جس طرح حالی کے تنقیدی شعور نے غالب کو
نماز پڑھنے کی تلقین کرنے پر مجبور کیا تھا، اسی طرح اقبال نے عصری شاعری پر
تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ پروفیسر
ضیاء احمد بدایونی نے "دیوان مومن" کا ایک نسخہ اقبال کے مطالعہ کیلئے روانہ
کیا۔ اقبال نے دیوان کی وصولی کی اطلاع دیتے ہوئے کلام مومن پر چند تنقیدی
تاثرات کا اظہار بھی کیا، اس خط کو بنیاد بنا کر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے ایک
مضمون آجکل مورخہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں لکھا تھا۔ اس کے جواب میں میرا مضمون "
ہماری زبان (مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ وہ مضمون میں یہاں نقل
کر رہا ہوں۔

رسالہ "آجکل" دہلی اکتوبر ۱۹۷۶ء میں بہ عنوان "اقبال اور مومن"
پروفیسر ظہیر احمد صدیقی صاحب نے مختصر لیکن اختلافی مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ ظہیر
صاحب نے اپنے مضمون کی بنیاد اقبال کے اس خط کو بنایا ہے جو انہوں نے پروفیسر
ضیاء احمد بدایونی کو "دیوان مومن" کی وصولی کی رسید کے طور پر ۹ر نومبر ۱۹۳۲ء میں
لکھا تھا، اور جس میں اقبال نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ انہوں نے مومن کا
کلام پہلی بار پڑھا، چند اعتراض کئے تھے۔ مثلاً یہ کہ ان کی شاعری سے مجھے بہت
مایوسی ہوئی۔ شاذ و نادر ہی وہ تغزل کے کسی حقیقی جذبہ تک پہنچ سکے (۱) ان کے
خیالات طفلانہ ہیں (۲) اور وہ اپنے جذبات کے سوقیانہ پن کو چھپانے میں ناکام
نظر آتے ہیں (۳) ان کے کلام میں وضاحت کی کمی سے نفسیاتی طور پر اس افسوس
ناک امر کی شہادت ملتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا جذبۂ حکمرانی انحطاط

پذیر ہو چکا تھا۔ (۲۰) گویہ ابہام اس لحاظ سے قابل قدر بھی ہے کہ وہ اس رجحان پر روشنی ڈالتا ہے۔ بیان کی وضاحت حکمران قوم کا خاصہ اور لازمہ ہوتا ہے۔ یہ کیفیت یعنی وضاحت کی کمی جو مومن کے ہاں اس قدر عام ہے۔ قدرے کم حد تک مومن سے زیادہ عمیق ذہنوں مثلاً غالب و بیدل میں بھی نظر آتی ہے۔ اس مریضی ذہنیت کی دیگر علامات یا نتائج میں قنوطیت اور تصوف بھی شامل ہیں جو ابہام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ عدم وضاحت سے گمراہ ہو کر اسے معنویت کا درجہ دیتے ہیں۔

اقبال کا خط بہت مختصر ہے۔ ویسے بھی خطوط میں صرف رائے ممکن ہے، وضاحت نہیں۔ وضاحت کیلئے تو دفتر چاہیئے۔ اس لئے میرے خیال میں محض اس خط کو موضوع نہیں بنایا جا سکتا، اور اگر بنایا بھی گیا ہے تو ضرور تھا کہ ظہیر صاحب اقبال کی نظر سے مومن کو پڑھنے یا جانچنے یا پھر مومن کے کلام کی روشنی میں اقبال کی رائے کو پرکھنے کی بجائے اقبال کے نظریہ شعری کو خود کلام اقبال کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرتے، اس نتیجہ میں خود بآسانی سمجھ سکتے تھے کہ۔ اقبال نے صرف مومن کو ہی نہیں اس دور کے اساتذہ جیسے غالب کو بھی ناقابل اعتنا کیوں سمجھا۔ ؟!

ظہیر احمد صاحب نے خود لکھا ہے کہ اقبال نے خط کو اس وقت لکھا جب کہ وہ ذہنی طور پر اپنے مقصدی اور اصلاحی مشن کے قریب تھے۔ "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کے خیالات ان کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکے تھے۔ اچانک ان کے سامنے ایک تغزل پسند شاعر کا دیوان آجاتا ہے"۔ ظاہر ہے زیر بحث خط اسی ردعمل کا نتیجہ ہے اور یہ ردعمل اور اس کے نتیجہ میں جو رائے ظاہر کی گئی وہ فطری ہے اور اقبال کے نقطہ نظر کے عین مطابق بھی ہے

بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ اقبالؔ نے ویسی تنقید نہیں کی، جیسی کہ ان سے امید کی جا سکتی تھی، اس کی وجہ بھی خط کی عدم گنجائش اور تنگ دامنی ہے۔ اقبالؔ کے لئے یہ کوئی موقع نہیں تھا کہ وہ مومنؔ کے بارے میں کھل کر بحث کرتے۔ البتہ اپنے نظریۂ شعری کا اظہار انہوں نے اپنی تقریروں، تحریروں اور شاعری میں کیا ہے۔ مجھے یہاں تفصیلات میں جانا نہیں ہے۔ لیکن اقبال کے نظریۂ شعری کی وضاحت کیلئے چند اشعار پیش خدمت ہیں، تاکہ قارئین خود اندازہ کر سکیں کہ مومن کی تنقید میں اقبالؔ کس حد تک حق بجانب ہے ؟

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

خون رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
مے خانۂ حافظ ہو کہ بت خانہ بہزاد

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

نظر سپہر پہ رکھتا ہے جو ستارہ شناس
نہیں ہے اپنی خودی کے مقام سے آگاہ

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ

ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسوں و افسانہ

یا یہ کہ

گو ہنر میں ہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

اور

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے ہیں جہاں پیدا

بات ایسی نہیں ہے کہ ظہیر صاحب کو میں اقبال کے نظریہ شعری سے متعارف کروانے جا رہا ہوں۔ لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ انہوں نے اقبال کے خط کو پڑھتے ہوئے کلام اقبال اور نظریہ شعری کو کیسے فراموش کر دیا۔ انہیں اس بات پر تعجب ہے کہ اقبال داغ کے شاگرد ہوتے ہوئے مومن پر معترض ہیں۔ لیکن مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ ایسے موقع پر انہیں حالی کی یاد کیوں نہیں آئی، جنھوں نے غالب کے شاگرد ہونے کے باوجود غالب کے کردار اور گفتار پر کھلے بندوں اعتراض کیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مقدمہ لکھ کر اس دور کی [illegible] شاعری کو جو زیادہ تر غزل سے منسوب تھی بول و براز قرار دیا۔ قابل گردن زدنی کہا، اور نئی شاعری کی ابتدا کی۔ اقبال اصل میں غالب کی نہیں حالی کی ہی توسیعی شکل ہیں، ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ مسدس کے مطالعہ کے بعد کلام اقبال کا مطالعہ فکر و خیال کی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ مسدس کی درد مندی اقبال سے شکوہ اور جواب شکوہ لکھواتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر غالب نہ ہوتے تو اقبال پیدا نہ ہوتے مغالطہ میں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے، کہ

حالی کے بغیر ہم اقبال کا تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ اقبال نے جہاں غالب کی زبان سے استفادہ کیا ہے وہیں اس نے حالی کے خیالات و نظریات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے ۔ اس لئے اگر اقبال، مومن، غالب اور بیدل کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں تو یہ کوئی مقام حیرت نہیں ہے ۔ البتہ مقام غور و فکر ضرور ہے ویسے اقبال نے اپنی بات کی وضاحت مختصر سے الفاظ میں خط کے آخری حصہ میں کر دی ہے ۔ اقبال نے کبھی کہا تھا ؎

علم و فن از پیش خیزانِ حیات

علم و فن از خانہ زادانِ حیات

حیات کی موجودگی میں علم و فن کی کیا قدر و قیمت ؟ اقبال نے انہیں پیش خیزان اور خانہ زادان حیات کہا ہے ، اور واضحتاً علم و فن کی حیثیت اس سے بڑھ کر ہو بھی نہیں سکتی اور پھر مومن اور غالب کا فن کس شمار و قطار میں ؎

یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا ! ؟

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا

اے قطرۂ نیساں ! وہ صدف کیا وہ گہر کیا

یہ چند اشارے ہیں ، ان لوگوں کے لئے جو بصیرت رکھتے ہیں ۔ اور یہ کہ جو شعر اور منصب شاعر کو سمجھتے ہیں ، وہ ان باتوں پر غور کریں گے ۔ آخر میں اقبال ہی کا ایک شعر نقل کروں گا ، گو مخاطبت مدیر مخزن سے ہے ۔ لیکن ظہیر صاحب بھی چاہیں تو غور فرما سکتے ہیں ؎

مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے ۔ جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

اگر اقبال نے یہاں سخن کا لفظ استعمال کیا ہے تو ان کی مراد میر، غالب ، مومن اور اسی قبیل کے دیگر غزل گو شعراء کی شاعری سے ہے ۔

اقبال نے جس معیار پر مومن اور دیگر غزل گو شعراء کو جانچا ہے۔ ظاہر ہے وہی معیار خود اقبال کی شاعری کا معیار قرار پائے گا۔ اس حیثیت سے اقبال کی شاعری جزویست از پیغمبری معلوم ہوتی ہے کہ اقبال نے قوانین خداوندی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اقبال نے جہاں زرتشتی، ہندوستانی، مارکسی اور مغربی افکار کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے فیضیاب ہوا ہے، وہیں انہوں نے قرآن حکیم سے بھی اکتساب کیا ہے۔ تاریخ اسلام ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہی ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے قرآن حکیم اور سیرت رحمتہ العالمین کا حقیقی اور آخری سرچشمۂ فکر ہے۔

اقبال نے جمہوریت پر وار کیا ہے۔ کیمونیزم پر اعتراض کیا ہے، سرمایہ داری اُن کی نگاہوں میں جچتی نہیں ہے۔ وہ مردِ مومن جس کی نگاہوں میں بصیرت قرآنی کی روشنی جلوہ بار ہو، بقول پرویز پورے حتم و یقین سے پکار اٹھتا ہے اور اس تہذیب جدید کے جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سے ضرب کھانے والوں سے للکار کر کہہ دیتا ہے کہ ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا۔

اپنے اس دعویٰ پر دلیل اقبال نے قرآن سے لائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔
وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۵

فرماتا اس پر شاہد ہے کہ انسان یقیناً ناکام رہنے والا ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالحہ کئے اور ایک دوسرے کو حق استقامت کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

اقبال نے دور حاضر کے محض سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی نظریوں کی نفی کی ہے اور اس کے بر خلاف اسلامی نظریۂ حیات کو پیش کرنیکی سعی مشکور کی ہے۔ دور حاضر کے نظریے انسان کو انسان سے نزدیک کرنے اور ایک عالمی معاشرہ کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہونے کے بجائے اولاد آدم میں تفرقے پیدا کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔ آج ہم ہندی ہیں پاکستانی ہیں، ایرانی و افغانی ہیں۔ ہم روسی ہیں چینی ہیں، امریکی و افریقی ہیں اور کالے اور گورے ہیں۔ چھوت چھات کے مسائل انسانی تہذیب کیلئے ناسور ہیں۔ زبان کے مسائل رسم الخط کے جھگڑے، دولت کی تقسیم اور ایسے کتنے ہی مسائل ہیں جن سے دنیا آج دو چار ہے ان کا حل کون ڈھونڈ نکالے گا۔ انسان ہر ہر قدم پر ناکام اور نامراد ہے و مختلف گروہوں اور طبقوں میں بٹ گیا ہے۔ اسلام اس کو وحدت کی تعلیم دیتا ہے۔ آپس میں بھائی قرار دیتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ وہ مسلمان جو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک ہے، اور ایک رشتۂ اخوت میں بندھا ہوا ہے وہ بھی بٹ گیا ہے۔ اس کے درمیان جغرافیائی سرحدیں حائل ہیں۔ وہ کہیں اقلیت میں ہے اور کہیں اکثریت میں۔ حالانکہ وہ عالمی معاشرہ کا ایک فرد ہے چاہے وہ ہندوستان میں رہتا ہو کہ پاکستان میں، ایران میں رہتا ہو کہ ترکی میں، چاہے وہ روس میں رہتا ہو کہ چین میں اسی طرح وہ امریکہ میں رہتا ہو کہ برطانیہ میں وہ بھائی بھائی ہے، اور وہ اسلامی نقطہ نظر سے ایک کل کا جز ہے اور کل سے مراد کل بنی نوع انسان ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے مسائل مسلمانوں کے ہوتے ہوئے بھی عالمی مسائل ہیں۔ اور ان کے حل کو عالمی خطوط پر تلاش کرنا چاہیئے۔ اگر ہم سارے انسانوں کو ایک جماعت

قرار دیتے ہیں تو ایسی صورت میں مسلمان بھی اسی جماعت کا ایک فرد ہوا۔
اور بقول اشتفاق حسین" اقبال کے نزدیک فرد کا وجود جماعت سے الگ
نہیں۔ خلوت و جلوت دونوں اس کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۹

تجلوتے ہم بجلوت نور ذات است
میان انجمن بودن حیات است

فرد کا وجود جماعت سے اس لئے الگ نہیں کہ بنی نوع انسان ایک رشتے
میں منسلک ہیں جس کی نوعیت حیاتی بھی ہے اور اخلاقی بھی، اور فرد کی
سیرت اور کردار جماعت میں ہی نشو و نما پاتے ہیں۔ فرد اور جماعت کا یہ
ربط اس وقت ایک ہموار معاشرہ اور تہذیب طرز معاشرت کا خلاق ہو سکتا
ہے، جب اسکا مطمع نظر سراسر انسانی ہو۔ اقبالؔ کے ہاں فرد اور
جماعت کا یہی تصور ہے" اس طرح فرد کی ذمہ داری دو چند ہو جاتی
ہے۔ وہ خود اپنی اصلاح کرے، اس کی خودی بیدار ہو اور پھر معاشرہ
کی اصلاح کیطرف قدم بڑھائے۔ اس لئے اقبالؔ نے اپنی شاعری میں
فرد کی تعمیر کا ایک واضح تصور پیش کیا ہے۔ فرد کی تعمیر یا خود کی اصلاح
کے بغیر صالح یا ہموار معاشرہ کی تشکیل ممکن نہیں ہے۔ گو فی زمانہ مسلم
قائدین عجیب قسم کی دو عملی کا شکار ہیں، ایک طرف تو وہ اسلامی معاشرہ
کی تشکیل کی بات کرتے ہیں اور شرعی قوانین کو نافذ کرنیکی کوشش کرتے
ہیں، اور دوسری طرف وہ خود قرآنی احکامات کی پابندی نہیں کرتے۔ مسلمانوں
کی سیاسی زندگی کا یہ عجیب المیہ ہے کہ ایسے ہی افراد کے ہاتھوں میں مسلمانوں
کی حکومتیں کھلونا بنی ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کیلئے لازمی ہے کہ وہ دنیا سے
غیر اسلامی قوانین کو مٹانے سے پہلے خود تمام نہاد اسلامی سلطنتوں کی اصلاح

کریں۔ کیونکہ ایک قرآنی مملکت ہی میں قرآنی احکام کی ترویج ممکن ہے۔ مسلم سماج اور مسلم ممالک کے اندر پایا جانے والا یہ تضاد اسلام کی ترقی اور رواج میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے۔ اقبال کی تیز بین نظریں اپنے دور کی بوالعجبی کو دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے انہوں نے شاہی کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔

تیا دیے رتن نے اقبال کے اسی انداز فکر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

> اقبال کا یہی وہ پیغام تھا جس نے مسلم ذہن کو جاگیردارانہ قیود سے نکال کر معاشرہ کو جدید ڈھانچے کے لئے تیار کیا، یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی محفل سخن گرم ہوگی ..... ہر جگہ وہ نغمے خاص توجہ سے سنے جائیں گے۔ جنہیں اسلامی احیا کے داعی محمد اقبال قلم نے غیر فانی بنادیا ہے۔ (ماہانہ شاعر جلد ۵۵ شمارہ ۲۔۱ ص ۱۳)

اقبال نے اسلامی افکار سے دلچسپی محض اس وجہ سے نہیں دکھائی تھی کہ وہ مسلمان ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اسلام ایک ایسا نظریہ حیات ہے جس کے ایجاب و قبول سے انسانیت کی فلاح اور بہتری ممکن ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف تیا دیے رتن نے بھی کیا ہے۔!

> "یہ شاید اقبال کی زندگی کے المیوں میں سے ایک المیہ ہے کہ کوئی فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والا اور انتہا پسند وطن پرست کو صرف مسلم حقوق کا زبردست حامی قرار دے۔ یہ بات اقبال کی ہر اس بات کے برعکس ہے۔ جس کے لئے وہ ڈٹا رہا۔ وہ ایک سچا انسانیت پرست تھا۔ عالمگیر برادری کی بنیاد کے طور پر، محبت، آزادی، اور مساوات کے اصول قریباً اس کے تمام نظموں میں پائے جاتے ہیں۔ (حوالہ ایضاً)

وطنیت

اقبال نے جب ہمالیہ اور ترانۂ ہندی جیسی نظمیں لکھا تو ملک کے ہر فرد نے انہیں ہندوستان کا قومی شاعر تسلیم کیا۔ اور جب اسی اقبال نے ترانۂ ملّی لکھا اور ۱۹۳۰ء میں نظریۂ پاکستان پیش کیا تو پاکستانی شاعر قرار پائے۔ اور آج جب کہ اقبال ہمارے درمیان نہیں رہے یہ بحث گرم ہے کہ اقبال واقعی ہندوستانی شاعر ہیں یا پھر وہ پاکستانی شاعر ہیں۔ ملک کا کثر طبقہ آج بھی اقبال کو اپنانے تیار نہیں ہے۔ جبکہ پاکستانی قوم نے اقبال کو اپنا قومی شاعر تسلیم کر لیا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، دونوں ہی باتیں صحیح بھی ہیں غلط بھی۔ صحیح اس وجہ سے کہ گو اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانہ میں ھمالہ، ترانۂ ہندی، نیا شوالہ، اور ہندوستانی بچوں کا گیت کے علاوہ رام، نانک اور سوامی رام تیرتھ پر نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اس لئے وہ ہندوستان کے قومی شاعر کہلائے۔ لیکن آگے چل کر ان کے نظریہ میں فرق آیا اور اقبال نے ہندوستان کے گیت لکھنے کے بجائے نہ صرف نظریۂ پاکستان پیش کیا بلکہ ترانۂ ملّی لکھ کر ساری دنیا پر مسلمانوں کے حق کو جتلایا ہے۔ اقبال کی قومیت کے بارے میں کہی گئی باتیں اس وجہ سے غلط ہیں کہ

اقبالؒ درحقیقت ہندوستانی ہیں اور نہ پاکستانی ہیں بلکہ وہ آفاقی نقطۂ نظر کے حامل شاعر ہیں، اس لئے ان کی عالمی حیثیت ہے۔ ایسی صورت میں اقبال کو پاکستانی یا ہندوستانی شاعر قرار دینا، اقبالؒ کی عظمت کو کم کرنا ہے اور خود کلام اقبالؒ کی غلط تاویل کے مترادف ہوگا۔

اپنے وطن سے محبت فطری بات ہے۔ اور اقبالؒ نے اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا ہے تو اس میں کچھ تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ وطن کی محبت کا یہ تخیل خالصتاً غیر سیاسی بھی ہے۔ عبدالسلام ندوی کے قول کے مطابق یہ ایک نہایت شریفانہ اخلاقی بلکہ فطری جذبہ ہے۔ جس سے کسی شریف آدمی کا دل خالی نہیں ہو سکتا۔ حضرت بلالؓ مکہ میں اسقدر ستائے گئے تھے کہ وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ تاہم جب ان کو مکہ یاد آتا تھا تو روتے تھے۔ اور پکار کر یہ اشعار پڑھتے تھے (اشعار کا مفہوم درج ذیل ہے)

(آہ کیا کبھی پھر وہ دن آسکتا ہے کہ میں مکہ کی وادی میں ایک رات بسر کروں اور میرے گرد اذخر وجلیل ہوں (مکہ کی گھاسوں کا نام) اور کیا وہ دن بھی ہوگا کہ میں مجنہ کے چشمے پر اتروں اور شامہ وطفیل مکہ کے پہاڑ مجھے دکھائی دیں۔

اقبالؒ کا آبائی وطن ہندوستان میں خاص کشمیر تھا۔ اس لئے کشمیر کی وادی کے روح کی نظمیں تخلیق ہوئیں۔ ان کے کلام میں وادی کشمیر کا حسن جھلکتا نظر آتا ہے ۔

بھوٹی عدن سے، محل ہوائے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

لیکن جیسے جیسے اقبالؔ کا شعور ارتقائی منزلیں طے کرنے لگا، اُن کے وطنیت کے تصوّر میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ چنانچہ اُن ابتدائی رباعیوں کے بعد جب بانگِ درا ہمارے سامنے آئی تو اب اقبالؔ کا وطن صرف کشمیر نہیں تھا بلکہ پورا برصغیر ہند ان کے خوابوں کا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ ہمالہ انہیں پورے ہندوستان کی فصیل نظر آنے لگا۔ اور جب انہوں نے وطن کی محبت سے سرشار ہو کر ترانۂ ہندی لکھا تو سارے ملک کے بچے اور نوجوان سب ہی نے مل کر گایا ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اقبالؔ نے ہندوستان کے سیکولر پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے ایک قومی گیت لکھا جس کے بول ہیں ؎

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ایک دن ایسا آیا کہ اقبالؔ کو خاکِ وطن کا ہر ذرہ دیوتا نظر آنے لگا۔ اور بھگتوں کے گیت میں انہیں شکتی اور شانتی نظر آنے لگی۔ یہ زمانہ اقبال کی قومی شاعری کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔ اسی وطنیت کے جذبہ میں ڈوب کر انہوں نے رام، نانک اور سوامی رام تیرتھ جیسے سپوتوں کو خراجِ عقیدت

پیش کیا ہے۔ ہم اقبال کی اسی قومی شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس میں ایک قسم کا والہانہ پن اور سلجھائی کی بو نظر آتی ہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ وطن سے محبت کا یہ جذبہ زمانہ آخر تک باقی و برقرار رہا۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں اُن کی نظم "شعاعِ امید" پیش کی جا سکتی ہے۔ بلکہ وہ یہاں کچھ زیادہ ہی جذباتی نظر آتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے؎

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز ۔۔۔ اقبالؔ کی اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن ۔۔۔ یہ خاک کہ ہے جسکا خزف ریزہ دُر ناب
اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غواصِ معانی ۔۔۔ جن کیلئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب

علاوہ ازیں اقبالؔ کے آخری دور کا اردو کلام جو ارمغان حجاز کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں بھی "ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" کے زیر عنوان نظم شامل ہے جس میں کشمیر کے حُسن کی تعریف کی گئی ہے۔ اس لئے ہمالہ سے خاک ہند کا جو مقدس تصور اقبالؔ کی شاعری میں ابھرتا ہے وہ آخری زمانے تک اسی آب و تاب کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اقبالؔ ہندوستان کا شاعر ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اقبالؔ نے ترانہ ملّی لکھی حق بجانب ہیں؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یہ تصور کسی عصبیت کی بنا پر نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اقبالؔ نے آگے چل کر پاکستان کا نظریہ پیش کیا اور جناح کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے قیام کی جدوجہد کریں۔ خود اقبالؔ نے بھی اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ اپنے نظریہ کو عام کرنے کی ممکنہ کوشش کی، اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہے۔ یہاں اقبالؔ کی دوہری حیثیت بن جاتی ہے۔

ایک طرف تو اقبالؔ نے ہندوستان سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے اور دوسری طرف ہندوستان کی تقسیم کا نقطہ نظر پیش کیا۔ اقبالؔ کے ہاں جو تبدیلی آئی وہ محض سیاسی تھی۔ وہ شاعر تو تھے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ سیاست داں بھی تھے۔ خود جناح بھی کسی زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر کہلاتے تھے۔ لیکن آگے چلکر یہی جناح مسلمانوں کے قائداعظم کہلائے۔ جناح اور اقبالؔ نے پاکستان کے قیام کے لئے جو جد وجہد کرتے رہے اس کے جواز اور عدم جواز سے مورخ ہی بحث کر سکتا ہے۔ میرے یہاں لکھنے کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ اس زمانے کے سیاسی حالات کچھ ایسے تھے کہ ملک کی تقسیم ناگزیر قرار پائی۔ چنانچہ خود ہندوستانی قائدین نے بھی با دلِ ناخواستہ اس تقسیم کو تقدیر کا نوشتہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اس لئے میرے خیال میں مدبّراقبالؔ کو شاعر اقبالؔ سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اقبالؔ نے شعری سطح پر کہیں بھی نعرہ پاکستان بلند نہیں کیا۔ اگر وہ ترانہ ملّی لکھتے ہیں تو اس کے پس منظر میں پاکستان کا نظریہ نہیں بلکہ وطنیت کا وہ تصور ہے جو سیاسی، معاشی، سماجی، اخلاقی اور مختصر یہ کہ انسانی نقطہ نظر سے غیر فطری نظر آتا ہے اور یہاں اقبالؔ نے ہندوں اور مسلمانوں کو یکساں طور پر ہدفِ ملامت بنایا ہے

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال نے اسلامی نقطۂ نظر سے وطنیت کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ؎

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وطنیت کا یہ تصور غیر مسلموں میں ہی نہیں بلکہ پان عرب ازم کی صورت میں خود مسلمانوں میں بھی موجود تھا۔ اور یہ بات قرآنی نقطۂ نظر سے انتہائی گمراہ کن ہے۔ اس لئے اس کی تکذیب اقبال نے ضروری سمجھی۔ اب اگر ہم ترانۂ ملی کا مطالعہ کریں تو اقبال کے اصلی منشاء کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور یہ غلط فہمی خود بخود دور ہو جاتی ہے کہ ترانۂ ہندی کے بعد ترانۂ ملی لکھ کر اقبال نے خود اپنی تردید کی ہے۔ یا یہ کہ اقبال نے ہندوستانی وطنیت سے دستبرداری اختیار کی اور یہ کہ اقبال نے مسلمانوں میں تنفر کے جذبات پیدا کیے۔ یہ سارے الزامات محض مفروضہ کے نتیجہ ہیں۔ ورنہ حقیقت اس سے سراسر مختلف ہے اصل میں وہ وطن پرستی سے مسلمانوں کو نجات دلانا چاہتے تھے جو بین الاقوامی سطح پر ایک "خدا" کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ جسکا لازمی اثر مسلمانوں پر بھی پڑھ رہا تھا۔ اقبال کے لئے سنت ابراہیمی کی تکمیل ضروری تھی۔ چنانچہ

اسی سُنّت کی تکمیل میں انہوں نے ترانۂ ملّی مسلمانوں کو سنایا؎

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
سالار کارواں ہے میر حجاز[۲] اپنا اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبالؔ کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اور یہ کارواں کن کن منزلوں سے ہو کر گذرے گا ؟ ؎

تو ابھی ہے رہگذر میں ہے قیدِ مقام سے گزُر
مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گزُر

اصل میں رنگ و نسل، ذات پات اور وطن کے خلاف اسلام نے آواز اٹھائی تھی اور سارے ہی انسانوں کو ایک اللہ کی مخلوق اور ایک آدم کی اولاد قرار دیکر رشتہ اُخوت اور بھائی چارگی کو استوار کیا تھا۔ بھلا ایسے میں اقبال کو یہ کیسا گوارا ہوتا کہ مسلمان رنگ و نسل اور وطن کے جذبات کے تابع ہو کر منتشر ہو جائیں۔ اقبالؔ نے وطنیت کے جذبہ کی جو نفی کی ہے وہ مقامی حیثیت سے نہیں بلکہ آفاقی اور عالمی حیثیت سے کی ہے۔ اور یہاں ملت اسلامیہ سے مراد کسی ایک ذات یا نسل کا اتحاد نہیں بلکہ تمام انسانوں کا نقطۂ اتحاد ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ پر اس کی بنیاد رکھ کر ایک ملت گیتی نورد پیدا کر دی ہے ؎

حکمتش یک ملت گیتی نورد بر اساس کلمہ تعمیر کرد

برخلاف اس کے ؎

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا۔
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

دراصل اقبالؔ نے کل بنی نوع انسان کو وحدت انسانی کی دعوت دی ہے۔ اس لئے میرے خیال میں اقبالؔ کو ہندوستان یا پاکستان میں تقسیم کرنے کے بجائے آفاق میں ڈھونڈنا چاہیئے۔ خود اقبالؔ نے بھی شاید اپنے بارے میں کہا ہے؟

نہ چینی عربی وہ نہ رومی و شامی　　سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی

اقبالؔ کے وحدت انسانی کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے میں یہاں اُن کی نظم جگنو کو پیش کروں گا۔ خصوصاً جگنو کا آخری بند بڑا معنی خیز ہے ملاحظہ ہو؟

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے　　انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا　　واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ　　نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی　　جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟
ہر شئے میں جب کہ پنہاں خاموشی ازل ہو

اقبالؔ انسانی وحدت اور یکتائی میں یقین رکھتے ہیں اس لئے اقبال کو جغرافیائی حدود میں مقید کرنے کی کوشش بیکار محض ہے۔ اقبالؔ کی تلاش ہندوستان یا پاکستان میں نہیں۔ بلکہ اس مردِ آفاق کو کائنات کی وسعتوں میں تلاش کرنا چاہیئے۔

جاوید اقبال

اقبال شاعر نہیں تھے ، فلسفی بھی نہیں ، وہ معلم نہیں تھے مورخ بھی نہیں اور وہ مدبر بھی نہیں تھے اور رہنما بھی نہیں ۔ اصل میں وہ رازدار توُن میخانہ تھے ۔ وہ ، وہ تھے جس کی نگاہ سے فرشتے اکسیر کا نسخہ چھپا تے پھرتے تھے ۔ وہ کیمیا گر تھے ، اور انہوں نے ایک ایسا نسخہ تیار لیا تھا جو اسم اعظم سے زیادہ اثر رکھتا تھا ، اور جسکا نام محبت تجویز ہوا تھا، اور یہی محبت اقبال کا بھی اور اقبال کی تمام تر شاعری کا محور اور مرکز رہا ہے اسی محبت کے جذبہ کو بے پایاں دیکھنا چاہتے تھے اور اسی جذبہ کو عام کرنے کیلئے انہوں نے شعر لکھے ہیں ۔ ورنہ ان کا مقصد شاعری کبھی بھی نہیں رہا ۔

نسخۂ محبت جب دریافت ہوا تو فرشتوں نے کیا کیا ؎

ہوش نے یہ پانی ہلتی نوخیز یہ جھرکا گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

مختصر یہ کہ کائنات کی رنگا رنگی اسی محبت کے دم سے ہے ۔ خود کائنات کی تخلیق اسی محبت کا نتیجہ قرار پائی ہے ۔ اس لئے اقبال نے اپنی شاعری کا مرکز اسی محبت کو قرار دیا ، اور آپ جانتے ہیں اقبال کو یہ نسخۂ محبت کہاں سے ہاتھ لگا ۔ انہوں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں اور اس کے بعد بھی مشرق و مغرب کی درسگاہوں میں اس کی تلاش کی مگر یہ کوشش رائیگاں گئی ۔ انہوں نے دنیا کے بڑے فلسفیوں اور ماہرو سیاست دانوں کی حکیمانہ باتیں سنیں لیکن بے فیض

ثابت ہوئیں۔ اقبالؔ اِن معنوں میں پیدائشی مسلمان ہیں کہ انہوں نے ایک مسلمان کے گھر جنم لیا، لیکن اقبالؔ نے ذہنی اور قلبی سطح پر اسلام قبول کیا اور تمام عمر کی تلاش و جستجو کے بعد ایک کمبلی پوشؐ کی زنبیل میں سے نسخۂ حیات اُن کے ہاتھ آیا۔ چنانچہ اقبالؔ نے ذاتِ رسالتؐ اور اسلام کو اپنی شاعری کا خزینہ بنایا۔ کلام اقبال کا مطالعہ اور اس کی تعبیر و تفسیر قرآن کو پڑھے اور ذات رسالتؐ کو سمجھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بلکہ اقبالؔ کی شاعری قرآن و حدیث کی منظوم تفسیر ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ کہنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ قرآن نے جس آدم کی تخلیق کی تھی اور جو ابلیس کے بہکانے میں زمانے کی فضاؤں میں کھو گیا اور جو وقت کے گذرنے کے بعد رسول عربیؐ کی صورت اپنی جھلک دکھا کر پھر غائب ہو گیا۔ اس آدم کی تلاش اقبال کا عین منشاء ہے۔ اصل میں وہ اپنی شاعری کے ذریعہ اسی آدم گم شدہ کی تلاش کرتے ہیں اور وہ اپنی شاعری کے ذریعہ اسی آدم کی تعمیر اور تخلیق بھی کرتے ہیں۔ اقبالؔ کی شاعری کا اگر ہم اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیں۔ تو اُن کے پیام کو سمجھنے میں آسانی ہوگی، اور اس طرح ہم اقبال کی صحیح دریافت بھی کر سکیں گے۔ میں اپنی بات کی وضاحت کیلئے یہاں جاوید اقبال کی مثال پیش کروں گا۔

جاوید اقبال بلا شبہ اپنے والد علامہ اقبالؔ کے فرزند دلبند رہے ہیں۔ لیکن جاوید اقبال ایک حقیقت ہوتے ہوئے بھی تصوراتی حیثیت رکھتے ہیں اقبالؔ نے جاوید کی پیدائش سے قبل ہی اپنے آدم گم شدہ جسے آپ اقبالیات میں "مرد مومن" کا نام دیتے ہیں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ لیکن اُن کا یہ عمل عمومی تھا۔ چنانچہ ان کے مخاطب اُن کی کوئی اولاد نہیں بلکہ عام بچے تھے۔ ان عام بچوں کیلئے اقبال نے بانگ درا میں جو کچھ لکھا وہی جاوید کے پیدا ہونے کے بعد

بالِ جبریل میں بھی جاوید سے راست مخاطب ہو کر کہا۔ اس کے ثبوت میں بچے کی دعا، ہمدردی اور ایک آرزو جیسی اولین نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اور پھر ۔ ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

٥

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ایک آرزو میں وہ کہتے ہیں۔

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

گویا اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے سے ہی بچوں کی ایک خاص انداز سے تربیت کرنا چاہتے تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ آگے چل کر انہی بچوں سے کچھ بڑے کام لیں، ایسے کام جن کی ادائیگی کیلئے آدم کی تخلیق ہوئی ہے۔ اقبال نے اس "بچہ" کو شاہین کا نام دیا ہے، اور شاہین سے متعلق بے شمار اشعار ہم کو اقبال کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ اقبال کا یہی عنود آگے چلکر مردِ مومن کہلاتا ہے۔ شاہین سے "مردِ مومن" تک کا یہ سفر تعلیم و تربیت کی مختلف منزلوں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اقبال نے مردِ مومن کا جو تصور پیش کیا ہے، اور جس انداز میں اس کی تربیت کی ہے اس کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم اقبال کے تعلیمی نقطۂ نظر کو بھی سمجھیں۔ دراصل اقبال کی شاعری میں مردِ مومن کی تعلیم کا ایک جامع نظام ملتا ہے۔ بدقسمتی سے آج تک بھی عملاً اس کی تدوین ممکن نہ ہو سکی۔

لیکن اقبالؔ کو خود اپنے افکار و خیالات کی روشنی میں ایسے نوجوان کی تعلیم و تربیت کا موقع ہاتھ آیا، اور خوش قسمتی سے حقیقت کی دنیا میں خود ان کا فرزند جاوید اقبال تھا۔ یہاں پھر جاوید اقبال کی ذات حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ تجرباتی بھی بن جاتی ہے۔ اقبالؔ نے مردِ مومن کی جستجو میں بچوں کی جس انداز میں تربیت کرنی چاہی، اس کا اندازہ جاوید کے تعلق سے ان کے رویہ سے لگایا جاسکتا ہے اقبالؔ گفتار ہی کے نہیں کردار کے بھی غازی تھے۔ خود کلام کی روشنی میں ہم اُن کی ذات کا تجزیہ کریں تو یہ روشن حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ انہوں نے وہی باتیں اپنے شعر میں کہنے کی کوشش کی ہیں جن پر وہ بڑی حد تک عامل تھے یا پھر یہ کہ وہ ایسی خواہش رکھتے تھے، علاوہ ازیں انہوں نے اپنے افکار کی روشنی میں جاوید کی تربیت کرنے کی کوشش کی۔

اقبالؔ کی تین اولادیں تھیں۔ آفتاب اقبال، جاوید اقبال اور منیرہ لیکن تینوں میں جاوید اقبال ان کی آنکھوں کا تارہ تھے۔ ان سے محبت کچھ اس وجہ سے بھی زیادہ تھی کہ جاوید ابھی گیارہ سال ہی کے تھے کہ اقبالؔ کی بیوی اور جاوید کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ عبدالسلام ندوی نے "اقبالؔ کامل" میں لکھا ہے اُن کی تعلیم و تربیت کے لئے ڈاکٹر اقبالؔ کو ایک استانی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی جس میں دیگر خصوصیات کے علاوہ یہ خوبی بھی ہو کہ وہ بچوں کو قرآن اور اردو پڑھا سکے اور ان کی اخلاقی اور دینی تربیت و نگہداشت کرے، اور اس سلسلہ میں انہوں نے بڑی تگ و دو کی۔ ان واقعات کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالؔ کو جاوید سے کتنی محبت تھی۔ یہ محبت محض اس وجہ سے نہیں تھی کہ جاوید اُن کے بیٹے تھے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ وہ چاہتے تھے کہ جاوید کی تربیت خود اُن کے اندازِ فکر کی روشنی میں ہو۔ اس طرح جاوید ان کی شاعری کا

موضوع بن گئے۔ حقیقی و تصوراتی۔

جاوید اقبال کے نام بال جبریل میں دو نظمیں اور ضرب کلیم میں ایک نظم شامل ہے۔ ان نظموں کے علاوہ اقبال کا آخری شعری کارنامہ "جاوید نامہ" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کارنامہ اقبال کی فکری تشکیل کا اعلیٰ نمونہ ہے اور شہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ گو جاوید نامہ اصل میں معراج نامہ ہے لیکن آخر میں وہ راست طور پر جاوید سے بھی مخاطب ہے۔ جاوید نامہ کے آخری اشعار ایسے ہیں جو نصیحت آمیز ہیں جنہیں "جاوید کو اپنی پوری شاعرانہ تعلیمات کا خلاصہ سمجھایا جائے"۔

بال جبریل میں شامل جاوید کے نام جو پہلی نظم شامل ہے اسمیں اقبال نے جاوید کو مخاطب ہو کر کہا ہے کہ عمر جاوداں کا سراغ خودی کے ساز میں ہے، خودی کے سوز سے امتوں کے چراغ روشن ہیں (یہ ایک بات اہم ہے کہ آدم صاحب مقصود ہے کیونکہ وہ اپنے میں بے پناہ وسعت رکھتا ہے اور ترقی کی اعلیٰ مہنر لیں بھی)۔ اقبال کہتا ہے کہ زاغ صحبت شاہین کی وجہ سے بلند پرواز تو نہ بن سکا، لیکن شاہین نے اس کی صحبت کے نتیجہ میں اپنی قوت کھو دی۔ اقبال جاوید سے نصیحتاً کہتے ہیں کہ زمانہ کی آنکھ سے حیا اٹھ چکی ہے۔ اس لئے ایسے ماحول میں خود کے کردار کی وہ حفاظت کریں۔ اس نظم میں اقبال نے جاوید پر خودی کی اہمیت آشکار کرنے اور بری صحبتوں سے محفوظ رہنے کی تلقین کی ہے۔ ایک اور نظم جو لندن میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر اقبال نے لکھی تھی، وہ اس وجہ سے زیادہ اہم ہے کہ اقبال اس میں راست طور پر جاوید سے مخاطب ہیں، اور نصیحت کا انداز واضح ہے۔ اس نظم میں اقبال جاوید سے کہتے ہیں کہ دیار عشق میں تم اپنا مقام پیدا کرو، نیا زمانہ

نئے صبح و شام پیدا کرو۔ خدا اگر دل فطرت شناس دے تو سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کرو۔ اقبال جاوید سے کہتے ہیں کہ فرنگی تہذیب کو اختیار کرنے کے بجائے سفال ہند سے مینا و جام پیدا کرا اور آخر میں وہ کہتے ہیں کہ مرا طریق امیری، نہیں فقیری ہے۔ اس لئے خودی کو نہ بیچ اور غریبی میں نام پیدا کر۔

جاوید کے نام تیسری اور اہم نظم ضرب کلیم میں شامل ہے۔ یہ نظم قدرے طویل ہے اور معنوی اعتبار سے بھی اہم ہے۔ اس نظم میں اقبال نے زمانے کی برائیوں اور خرابیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور واضح طور پر دین پر قائم رہنے کی تلقین و ہدایت کی ہے اور اس بات کا احساس بھی دلا رہے ہیں کہ ؎ جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اسکا مذاق عارفانہ

جوہر میں ہو لاالہ تو کیا خوف تعلیم ہو اگر فرنگ آنہ

اقبال نے جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کے فرق کو واضح کیا ہے اور جاوید اقبال سے کہا کہ اگر تم جدید تعلیم حاصل کرو تو اس میں حرج نہیں، لیکن مغربی تہذیب سے اجتناب برتو۔ کیونکہ یہ تہذیب ننگ انسانیت ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے اقبال کے اُن نظریوں کی بھی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ جو مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے متعلق ہیں۔ اقبال دراصل روشن دماغ شاعر تھے اور انہوں نے کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مغربی انداز کی تعلیم کے بغیر مسلمان زمانہ میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔ لیکن انہوں نے سرسید کیطرح مغربی طرز کی پیروی کو لازم قرار نہیں دیا۔ اصل میں وہ شبلی کی میانہ روی کو پسند کرنے والے تھے۔ وہ خود بھی لندن کے تعلیم یافتہ تھے اور سوٹ پہنتے تھے لیکن اس ظاہری لبادے نے ان کی روحانی قوت کو مغلوب نہ کرسکا۔ وہ بنیادی طور پر فقیر تھے ایک ایسے فقیر جو اسرار

جہانگیری کو کھوتا ہے، جو اپنے خاصیت اکسیری کھتی ہے اور جو میراث مسلمان بھی ہے اور سرمایۂ شبیری بھی۔ اس لئے وہ جاوید سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

جاوید اقبال کے لئے یہ نصیحت اس لئے بھی ضروری تھی کہ نئی نسل نئی تعلیم نئی تہذیب کے زیر اثر اسلامی تہذیب سے دور ہوتی جارہی تھی چنانچہ اپنے ان احساسات کا اظہار انہوں نے عموی طور پر "ایک نوجوان کے نام" اپنی ایک دوسری نظم میں اس طرح بیان کیا ہے۔

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نا امید، نومیدی زوالِ علم و عرفان ہے
امید مرد میداں ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اقبال نے اپنی شاعری میں جاوید سے خاص طور پر اور نوجوانوں سے عام طور پر

جو باتیں کہی ہیں، اُن پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے مغربی تعلیم کو نوجوانوں کے لئے ضروری تو سمجھا۔ لیکن مغربی تہذیب کی نفی کی ہے، اس کے برخلاف انہوں نے اسلامی تعلیمات کو مسلم نوجوانوں کیلئے لازمی و ضروری قرار دیا۔ ان کے کلام میں خودی، فقر، غریبی، استغنا اور عشق پر زور دیا گیا ہے۔ یہہ ایسے عناصر ہیں جن کے بغیر فرد کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ اور پھر اقبال تو مرد مومن کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ جس کے ہاتھ میں زمانے کا مقدر ہوتا ہے۔ اس لئے بھی انہوں نے جاوید کو بار بار مغرب سے حذر کرنے اور اسلامی غنا اور فقر کو اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور جب وہ جاوید کو نماز پڑھتے دیکھتے ہیں تو دعا کرتے ہیں ؎

چہ میخواہی ازیں مردتن آسائے   بہر بادے کہ آمد رفت ازجائے
سحر جاوید را در سجدہ دیدم   بہ صبحش چہرۂ شامم بیارائے

گو اقبال نے اپنے فرزند کو راست مخاطب کیا ہے، لیکن اُن کا مخاطب ہر دور کے نوجوان ہیں ؎

فیض یہ کس کے نظر کا ہے کرامت کس کی ہے
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

سیاست

اقبالؔ جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ مختلف انقلابات سے دوچار تھا خود ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ سرسید احمد خاں اور راجہ رام موہن رائے نے جو تعلیمی تحریک وسط انیسویں صدی میں شروع کی تھی وہ اب سیاسی میدان میں اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہو چکی تھی۔ کانگریس دبے دبے سے لہجہ میں سوراج کا نعرہ بلند کر رہی تھی، اور اقبال نے جس زمانہ میں شعر کہنا شروع کیا، وہ دور تو ہندوستانی قومیت اور تحریک آزادی کا نقطۂ عروج تھا اسی زمانہ میں یعنی بیسویں صدی کے پہلے سال ہی اقبالؔ نے لاہور سے اپنی آواز بلند کی اور یہ آواز "ہمالیہ" کے زیر عنوان بلند ہوئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہندوستانیوں کی دل کی آواز بن گئی۔ اس نظم کو ہماری قومی زندگی میں وہی مقام حاصل ہوا جو خود کوہ ہمالیہ کو حاصل تھا۔ یعنی اقبالؔ کے ابتدائی زمانہ کی یہ نظم ہندوستانی قوم کی ترجمان بھی ہے اور نگہبان بن گئی ہے ؎

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا ۔۔۔ مسکن آبائے انساں جب بنا دامن تیرا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا ۔۔۔ داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اقبالؔ نے جب گردش ایام کو پیچھے کی طرف دوڑنے کہا تو ان کا مقصد ماضی پرستی نہیں تھا۔ بلکہ وہ آزادی کے دن تھے جسے ہندوستانی قوم تاریخ کے المیہ کے نتیجہ میں کھو چکی تھی، اور جو ۱۸۵۷ء میں غدر کے نام سے ظاہر ہوا تھا۔ اسی طرح نظم "ہمالیہ" سے اقبالؔ نے اپنے ابتدائی دور میں سیاسی افکار

و افکار کا اظہار کا ذکر کر دیا تھا۔ اور سیاست سے اُن کی یہ دلچسپی، زمانہ آخر تک برقرار رہی تھی، کیونکہ وہ حالات اقبال کی موت تک باقی تھے۔ جن کے مجبور کرنے پر اقبال نے سیاست کے بارے میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ملک تو اُن کے انتقال کے تقریباً دس سال بعد آزاد ہوا۔ وقت کی یہ عجیب ستم ظریفی رہی کہ وہ بلبل خوش نوا جس نے ملک کی آزادی کے ترانے الاپے اور جو ملک کی آزادی کیلئے تڑپتا پھڑکتا رہا، ملک کے آزادی کی خوشگوار واقعہ کے ظہور پذیر ہوتے وقت ہم میں موجود نہیں تھا۔

اقبال نے ہمالیہ کے بعد کئی ایک نظمیں لکھیں۔ چنانچہ بانگ درا کی نظموں میں پرندے کی فریاد، صدائے درد، سید کی لوح تربت، ترانۂ ہندی، جگنو، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، سوامی رام تیرتھ، طلبائے علی گڑھ کالج کے نام، ترانۂ ملی، وطنیت، رام، نانک، پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ، اسیری، سرمایہ و محنت، دنیائے اسلام اور طلوع اسلام خاص اہم نظمیں ہیں جن کا مطالعہ اقبال کے اس ذہنی سفر کی نشاندہی کرتا ہے جو اقبال نے ابتدائی زمانہ میں طے کیا تھا۔ اقبال اپنے اُس میں جب کہ وہ ابھی لندن ہو نہیں آئے تھے۔ ہندوستان کی قومی تحریک سے متاثر تھے اور وطنیت کے جذبہ سے سرشار تھے۔ لیکن جب انہیں مغربی ممالک کے دورہ کرنے اور مغربی سامراج کی چالوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو ان کے سیاسی عقائد میں تیزی سے تبدیلی آنی شروع ہوئی، بعد انہوں نے قومیت اور وطنیت کے نظریوں کی ببانگ دہل مخالفت کرنی شروع کردی۔ میری اس بات کی تائید ان کی نظموں ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا گیت یا رام نانک اور سوامی رام تیرتھ جیسی قوم پرستانہ نظموں سے ہوتی ہے۔ نیا شوالہ

تو انقلابی نظم تھی، جس نے قوم کے ایک بڑے طبقہ کو بہت متاثر کیا۔ لیکن اقبال نے لندن سے واپسی کے بعد خالص وطن دوستی کے جذبہ پر ضرب کاری لگائی ہے اور اقبال کی یہ ذہنی تبدیلی کچھ یوں ہی نہیں تھی، یا یہ کہ کسی تعصب کا نتیجہ بھی نہیں تھی، اور یہ سمجھنا کہ اقبال نے ترانۂ ملی لکھ کر ترانۂ ہندی کی تردید کی ہے سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی کا نتیجہ ہے۔ اصل میں ترانۂ ملی اقبال کی پہلی نظم ترانۂ ہندی کا تسلسل ہی ہے، یہ اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں یہاں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اقبال کا جو ذہنی سفر ہے یا یہ کہ فکر اقبال کا جو تسلسل ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں میں خلیفہ عبدالحکیم کی مدد سے اپنی بات واضح کروں گا۔

جب وہ (اقبال) یہ کہتا ہے کہ انسان کو وطنیت سے پاک ہونا چاہیئے اور اس کے گرد کو دامن سے جھٹک دینا چاہیئے تو اس سے اس کی مراد فقط وہ غلط وطنیت کا جذبہ ہے۔ جس نے مغربی اقوام کو اندھا کر دیا۔ وہ اس غلط وطنیت سے بچا کر اپنے ہموطنوں کو وطنیت کے اس جذبہ کی طرف لانا چاہتا تھا، جو کسی خاص زمین کے ٹکڑے کی پرستش پر مبنی نہ ہو بلکہ عروج انسان اور اس کی روحانی ترقی کے ماتحت ہو۔ ہندوستان کے دوسرے مشہور عالم شاعر ٹیگور کا نقطہ نظر بھی اقبال سے کچھ الگ نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ٹیگور میں جذبہ وطنیت نہیں ہے، لیکن مغربی رنگ کی وطن پرستی کے خلاف ٹیگور نے اپنی آواز بلند کی۔" اقبال نے اپنے اس نقطۂ نظر کو" وطنیت میں یوں ظاہر کیا ہے ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال کے خیال میں وطن ایک خدا کی صورت جب اختیار کرلیتا ہے ؎

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے

علاوہ ازیں اقوام جہاں مختلف گرہوں میں بٹ جاتے ہیں، وہیں سیاست کا گھر صداقت سے خالی ہو جاتا ہے اور کمزور کا گھر غارت ہوتا ہے. یہ تو عمومی حیثیت سے ہوا۔ خصوصی طور پر مسلمانوں کیلئے بھی وطنیت کا یہ جذبہ گھاٹے کا سودا تھا کیونکہ بقول اقبال تہذیب نوی کا تراشیدہ یہ بت غارت گر کاشانۂ نبوی تھا اس کی وجہ سے توحید کے قوی بازو کٹ جاتے تھے اور سنت رسول صلعم کے یہ مغائر بھی تھا۔ اسلئے انہوں نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا ؎

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبال نے وطنیت کے جذبہ سے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں ہندوں کو بھی متنفر کیا، کیونکہ مغرب میں جس قسم کا تصور پایا جاتا ہے وہ مساوات اور آزادی جیسے علی اقدار کے خلاف ایک محاذ نظر آتا ہے، اس کے نتیجہ میں نسل پرستی اور محدود قومیت کے تصورات کو مدد ملتی ہے ۔ اقبال اصل میں آزادی، اخوت اور مساوات انسانی میں یقین رکھتے تھے ۔ اُن کا نظریہ ان معنوں میں عالمی، آفاقی اور ہمہ گیر تھا کہ گلستان کے سبھی پھول کو کھلتا، مہکتا دیکھنا چاہتے تھے ۔ وہ جیو اور جینے دو کے اصول کے قائل تھے ۔ چنانچہ ان کے خیالات کی جھلک ہمیں اُن کی ابتدائی نظموں مثلاً جگنو اور پرندے کی فریاد جیسی نظموں میں نظر آتی ہے ۔ پرندے کی فریاد میں جو تڑپ ، بے چینی اور اضطراری کیفیت جو پرندہ کی اندر ہے ، وہ غلامی کا لازمی نتیجہ ہے ۔ اور اقبال چاہتے تھے کہ ہندوستانی قوم میں بھی یہ تڑپ کہ بے چینی اور اضطراری کیفیت پیدا ہو ۔ اور جب پرندہ اپنی

انسان کی عقابی نظر جلد ہی اس چمکدار شئے کی خامیوں اور کمزوریوں کو بھی دیکھ لیتی ہے وہ واپس ہوتے ہیں اور کہیں پناہ ملتی ہے تو صرف اسلام کی پناہ گاہ میں اقبال نے اسلام کو اس کی حقیقی صورت میں قبول کیا ہے۔ اس لئے قدم قدم پر وہ اس سے رہبری حاصل کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے اس دور کے مسلمان خود بھی اسلام سے دور تھے اور صرف رسوم کو اسلام سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی یہ کج فہمی اقبال کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ خصوصاً منبر و محراب کے اجارہ داری اور کوتاہ اندیشی علماء کے تعلق سے اقبال نے کھری کھری باتیں سنائی ہیں چنانچہ وہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر بھی چوٹ کرتے ہیں ؎

حق راسجودے صنماں را طوافے　　بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

اور ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

رہ رسم حرم نامحرمانہ　　کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہن چاک　　نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ

مذہبی ٹھیکیداروں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ؎

دور حاضر ہے حقیقت میں وہی عہد قدیم　　اہل سجادہ ہیں یا اہل سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا زور　　سیکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام

خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

اقبال نے وطنیت کے علاوہ جن بتوں کو توڑا ہے ان میں جمہوریت، سرمایہ داری کمیونیزم اور لادینی سیاست جیسے بت بھی شامل ہیں۔ جو اس دور کا مقدر بن گئے ہیں۔ جمہوریت دور جدید کا مقدر بن گئی ہے۔ لیکن انسانی تقدیر کا یہ عجیب المیہ ہے کہ وہ تباہی سے بچنے کیلئے دوسری تباہی کو مول لیتا ہے۔ شاہی

اپنی آرزو کا اظہار کرتا ہے ؎

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

تو یہ آرزو کسی پرندے کی نہیں خود ہندوستانی قوم کی ہے، اقبال کی ہے یہاں اقبال کا لہجہ بہت ہی بجھا بجھا سا ہے۔ یہاں وہ آزادی کی آرزو کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جیسا جیسا زمانہ گذرتا گیا، اور جوں جوں انگریز سامراج کا ظلم بڑھتا گیا۔ آزادی کی آرزو آتش بداماں ہوتی گئی، اور اقبال کا یہی نرم لہجہ، انقلابی گونج کی صورت اختیار کر لیتا ہے ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

اور جب یہ آدابِ جنوں، شاعر مشرق سیکھ لیتا ہے تو ہندوستان کی تحریک آزادی بھی ایک نیا موڑ اختیار کر لیتی ہے۔

اقبال کے سیاسی افکار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے صرف "وطنیت" کے تصور ہی کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس دور کے جو مغربی و مشرقی سیاسی نظریئے تھے ان کی بھی نفی کی ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے ایک دانشور کی حیثیت سے انہوں نے اقوام عالم کے مختلف نظریوں کی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کی نظمیں نپولین، مسولینی، کارل مارکس اور لینن اس بات کا ثبوت ہیں۔ اقبال کا مطالعہ وسیع تھا، اور اس سے وسیع ان کا مشاہدہ تھا، اور خوبی یہ کہ اقبال کی نظر اسلام پر تھی، جو کائنات کا سب سے بڑا انقلابی نظریہ ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اقبال کی فکر کہیں بھٹکنے نہیں پاتی وہ ہر شے کو قریب سے دیکھتے ہیں۔ اس کی آب و تاب سے متاثر ہوتے ہیں۔

کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔ جمہوریت کیا ہے؟ اقبال کی زبانی سنئے۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اقبال نے جمہوریت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا اور وہ گذر گئے

جمہوریت کے تجربہ سے اس وقت ہم گذر رہے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کا وجود میں آئے ۴۷ سال کا عرصہ بیت گیا۔ ان چھیالیس برسوں میں ہند و پاک کی سیاسی تبدیلیاں ہمارے سامنے ہیں، خصوصاً پاکستان کا تلخ تجربہ آمریت اور پاکستان کی تقسیم ...... کم ازکم پاکستانی سیاست کے پیش نظر ہم نہیں کہہ سکتے کہ جمہوریت کا تجربہ وہاں کبھی کامیاب بھی رہا ہے۔ برصغیر سے ہٹ کر امریکہ، روس اور خصوصیت سے عرب و افریقہ کے اسلامی ممالک میں جہاں جہاں جمہوریت کا نظام رائج ہے وہی تباہی مچی ہوئی ہے جو کبھی شاہوں کے دور میں ہوا کرتی تھی۔ سرمایہ دار ممالک میں انسانی ناز برداری کے واقعات روزمرہ کی چیز ہیں۔ انسانیت جمہوریت کے ان بلند و بالا ایوانوں کے زیر سایہ جانک رہی ہے۔ اس لئے اقبال نے اس سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی، اس سلسلے کی نظم سرمایہ و محنت ہماری خصوصی توجہ چاہتی ہے۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

مزدور کو اسکی تباہی کا احساس دلانے کے بعد اقبالؔ پھر مخاطب ہوتے ہیں ؎

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

گویا اقبالؔ نے مزدوروں کو دعوت انقلاب دی، اور یہ دور مزدوروں کے انقلاب سے عبارت بھی تھا۔ فرانس میں جو تحریک روسو کی وجہ سے پندرھویں صدی میں شروع ہو چکی تھی زار کے زوال کے بعد اپنے انتہائی عروج کو پہنچ چکی تھی۔ روس میں مزدور انقلاب کی کامیابی نے انسانیت کو ایک نیا سہارا دیا تھا، اور طلوع اسلام کے بعد عالمی تاریخ کا یہ سب سے بڑا انقلاب تھا۔ جسے اقبالؔ نے بھی قبول کیا اور لینن کو خدا کے حضور میں پیش کر دیا۔ یہ اقبالؔ کی آزادی سے محبت اور مغربی سامراجیت سے دشمنی کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے مغرب کے خلاف ہر آواز کو لبیک کہا۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت اقبالؔ کے پنولین اور مسولینی کی پیٹھ ٹھونکی۔ یہاں اس توصیف سے اقبالؔ کی مراد بربریت کو ہوا دینا نہیں بلکہ سامراجیت اور سرمایہ داری کو شکست فاش دینا تھا۔ اصل میں یہ انتقامی جذبہ تھا۔ جس نے اقبالؔ کو مسولینی اور پنولین کی تائید کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ مسولینی کے زبان میں سرمایہ داروں سے سوال کرتے ہیں ؎

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

لیکن اقبالؔ کا یہ منفی انداز فکر، ان کے سیاسی افکار کی بنیاد نہیں ہے۔ وہ جلد ہی مزدور کے انداز حیلہ بازی کو تاڑ جاتے ہیں اور مزدوروں کی آڑ میں جو نئی ہئیت ابھر رہی تھی اسے بر[illegible] کی ضرب لگاتے ہیں۔ چنانچہ کارل مارکس سے

آواز کے زیرعنوان لکھتے ہیں ؏

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش مریز و کجدار کی نمائش
جہانِ مغرب کے بتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہیں عقل عیار کی نمائش

اور وہ پھر مایوس ہو کر اس انقلاب کے بارے میں فرماتے ہیں ؏

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و حیات
خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت

یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال دنیا کے افکار سے مایوس ہو کر رجوع بہ درگاہ خداوندی ہوتے ہیں، اور صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں پورے اقوام عالم کے نجات کا ذریعہ انہیں صرف قرآن نظر آتا ہے۔ چونکہ مسلمان اس کتاب کے دعویدار ہیں، اس لئے اقبال کے پہلے مخاطب یہی ہیں۔ یہاں وہ محض کسی تنگ نظری کی وجہ سے مسلمانوں سے مخاطب نہیں ہیں۔ اقبال کے خیال میں مسلمانوں کی اصلاح اقوام عالم کی اصلاح کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے وہ اشتراکیت کی بھی کھل کر مخالفت نہیں کرتے ان کے اس خیال کی وضاحت، سیاسیات مشرق و مغرب کے چند شعروں سے ہو سکتی ہے ؏

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرف قُلِ اَلعَفو میں پوشیدہ ہے ابتک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اس انداز کی دوسری نظموں میں " لادین سیاست " بھی ایک نظم ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالؔ مغربی سیاست اور مغربی تہذیب سے بالکلیہ مایوس ہو چکے تھے اور انہیں انسانیت کی نجات صرف اسلام میں نظر آتی تھی۔ اقبالؔ کے اس ذہنی سفر کا مطالعہ ہمیں کسی مذہبی عصبیت اور تنگ نظری کے ساتھ نہیں، بلکہ سچائی کو قبول کرنے کے جذبہ کے ساتھ کرنا چاہیے۔ جس کے نتیجہ میں یقیناً ہم ایک سچی اور سیدھی راہ کو اختیار کر سکیں گے، ورنہ انسانیت کے قافلے یوں ہی نور و ظلمت کی منزلوں سے گذرتے رہیں گے۔ ظلمت سے مکمل نجات کی خواہش انہیں مزید تاریکیوں میں لے جایئگی۔

اقبالؔ کے اس نظریوں کی روشنی میں اگر ہم اقبالؔ کی زندگی کا مطالعہ کریں، تو اندازہ ہوگا کہ وہ محض گفتار ہی کے نہیں کردار کے بھی غازی تھے۔ انہوں نے جس اسلامی سیاست کا تصور پیش کیا تھا۔ وہ سیاست اس سے بالکل ہی مختلف تھی۔ جس میں حصہ لینے کی انہیں دعوت دی جا رہی تھی۔ تاہم ان کا خیال تھا کہ تاوقتیکہ پوری قوت سے افکار باطلہ کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ افکار صحیح کو پرورش پانے اور سرخرد ہونے کا موقع نصیب نہ ہوگا۔ ہندوستانی سیاست میں یقیناً اقبالؔ کو کوئی بڑا مقام نہ مل سکا۔ اس کی وجہ خود اقبالؔ کی مصلحت پسندی تھی یا پھر خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں اقبالؔ کی سلامتی طبع کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ اس لالچ میں نہیں آئے۔ جب اصرار بڑھا تو اقبالؔ نے جواباً کہا ؏

مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں سو جود مگر ہے کمی ہے کہ ایکہوں اثم سے جو ہو فاش فرماز

ڈھب مجھے نظم فسروغی کا نہیں یاد کوئی

اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

حضرت انسان کی رات کو سحر کرنے کیلئے اقبالؔ نے جہاں مغربی فکر اور مشرقی فلسفہ کی تردید کی وہیں مسلمانوں کو انہیں خواب غفلت سے جگانے کی سعی مسلسل بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں طلوع اسلام، مسلم، دریوزہ خلافت، ہسپانیہ، اے پیر حرم، مرد مسلمان اور امرائے عرب کے علاوہ شکوہ اور جواب شکوہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اصل میں یہ نظمیں ان کی ابتدائی نظموں مثلاً سلطان ٹیپو کی وصیت کا تسلسل ہیں۔ جہاں اقبالؔ نے مغربی تہذیب فساد قلب ونظر قرار دیا، وہیں افراد فرہنگ کو اولاد ابلیس قرار دیا ؎

تیری حریف ہے یارب سیاست افرنگ

مگر ہیں اسکے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے

بنائے خاک سے اسنے دو صد ہزار ابلیس

جب اس ابلیس نے خاک سے دو صد ہزار ابلیس بنائے تو ان کے نام ایک فرمان بھی جاری ہوا۔ جس میں خاص طور پر ہدایت تھی ؎

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز

ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

اقبالؔ کی دور رس اور عقابی نگاہوں نے اِن سازشوں کو دیکھ لیا تھا۔ جو دنیا کے بڑے بڑے ممالک مسلمانوں کے خلاف پس پردہ کر رہے تھے۔ جہاں اقبالؔ نے سیاست لادین کا پول کھول دیا اور جہاں افرنگی سیاست کی برائیوں کو کھول کھول کر بیان کیا وہیں اس نے مسلمانوں سے بھی خطاب کیا۔ خصوصاً عربوں میں جو نااتفاقی، پھوٹ، انتشار اور علاقائی عصبیت پائی جاتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے بین الاقوامی اتحاد کے لئے ہمیشہ خطرہ بنی رہی۔ اقبالؔ پان اسلام ازم کے قائل تھے اور بین الاقوامی ہر سطح پر پہلے اتحاد چاہتے تھے اور پھر اسی جمعیت اقوام کو جمعیت آدم میں بدلنا چاہتے تھے امرائے عرب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدِؐ عربی سے ہے عالمِ عربی

اس سلسلے کی نظموں میں جمعیت اقوام متحدہ دین و سیاست اور مکّہ اور جینوا بھی کافی اہم نظمیں ہیں۔ مکّہ اور جینوا میں وہ کہتے ہیں ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم
مکّے نے دیا خاکِ جینوا کو یہ پیغام — جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

جمعیت اقوام سے جمعیت آدم میں بدلنے کا خواب اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جبکہ جینوا سے ان کوششوں کا مرکز بدل کر طہران کیا جائے ؎

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جینوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

جینوا سے طہران کی یہ منتقلی محض مقامی نہیں نظر آتی ہے۔ یہ کسی تعصب کا نتیجہ نہیں تعصب کی بیخ کنی ہے۔ اقبالؔ نے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے۔ اسلام

کو ذہنی اور قلبی سطح پر قبول کیا ہے۔ تو اس کے معنی یہی ہیں کہ اسلام محض ایک مذہب ہی نہیں ہے ایک نظریہ حیات ہے جس کے ذریعہ انسانیت کی نجات ممکن ہے اور جس کی روشنی میں انسان انسان کو پہچان سکتا ہے۔ اسی سے احترام آدمیت کا درس یہیں ملتا ہے۔ جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آدم مٹی سے بنے تھے، اور تمام انسان اسی ایک آدم کی اولاد ہیں تو نہ صرف انسانی برادری کا تصور ابھرتا ہے بلکہ انسان کی فطرت میں خاکساری، عجز و انکساری کے جوہر بھی کھلتے ہیں۔ بقول سلیم چشتی " بنی نوع آدم جسمانی اور دماغی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہو جائیں .... تو افراد یکتا کی ایسی نسل پیدا ہو جائے گی، جو حقیقی معنوں میں خلافت و نیابت الٰہیہ کی اہل ہوگی۔" اقبال نے اسرارِ خودی میں لکھا ہے " نیٹشے " نے بھی اپنے تخیل میں افرادِ یکتا کی اس ترقی یافتہ جماعت کی ایک جھلک دیکھی تھی لیکن اس کے الحاد اور نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا۔" اس لئے اقبال اپنی ملت پر اقوامِ مغرب سے قیاس نہیں کرتے، بلکہ ان کی نظر میں، رسولِ ہاشمی کی تعلیمات زیادہ اہم ہیں کیونکہ اقوامِ مغرب کی جمعیت کا انحصار ملک و نسب پر ہے، جب کہ رسولِ ہاشمی کی تعلیمات کے پیشِ نظر جمعیت کا انحصار مذہب پر ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں اقبال مسلمانوں کو اتحادِ ملی کا درس دیتے ہیں ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

؎

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

اقبالؔ کے نزدیک مذہب محض چند رسوم و روایات کا کوئی مجموعہ نہیں ہے۔ اصل میں مذہب جمعیت آدم کی بنیاد ہے جس کا وہ خواب دیکھتے رہے ہیں۔ اس لئے وہ مذہب پر زور دیتے ہیں اور مذہب اسلام کو اپنی شاعری کا پیام بنا کر بنی نوع انسان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ "آج کل" کے حالیہ نمبر (نومبر ۱۹۷۵ء) میں کلیم الدین احمد اور فراق گورکھپوری کے دو انتہائی نزاعی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے دونوں ہی حضرات کی علمیت، قابلیت اور ذہنیت کا بھرم کھل جاتا ہے۔ فراق گورکھپوری نے انسان اور حیوان کا تقابل حسین انداز سے زیر نظر اقتباس میں پیش کیا ہے، اسے میں بلا تبصرہ پیش کر رہا ہوں، تاکہ اُن کی فکر کے بارے میں آپ خود کوئی رائے قائم کر سکیں۔

انسانی وحدت یا انسان کی سلامتی یا انسانوں میں باہمی تعاون کبھی اس امر پر مبنی یا منحصر نہیں رہا اور نہ قیامت تک اس امر پر مبنی اور منحصر ہو سکے گا کہ دنیا بھر کے انسان ایک خدا، ایک اوتار ایک رسول، ایک الہامی کتاب، ایک ملت، ایک مذہب اور ایک رسم و رواج کو مانیں یا ایک کعبہ یا ایک کاشی کو مانیں۔ بیسویں صدی کی اہم تصنیفات میں شہرہ آفاق محقق اور مفکر پرنس کروپاٹکن کی کتاب ہے، امداد باہمی *Mutual Aid* اس کتاب میں بتایا ہے کہ انسان کے پیدا ہونے کے کئی لاکھ برس پہلے سے آج تک صدہا جانداروں اور کیڑے مکوڑوں میں باہمی محبت باہمی امداد اور گہرے سے گہرا احساس وحدت کار فرما رہا ہے۔ اور آج تک ہے۔ اور قیامت تک رہے گا۔ کسی خدا، کسی رسول کسی الہامی کتاب کسی مذہب و ملت کی رہنمائی کی ذرا بھی ضرورت یا

یا پل بھر کے لئے بھی ضرورت ان جانداروں کو نہیں ہوتی، اور انھوں نے اپنی پوری آبادی میں صلح کرلی۔ چونٹیوں کی آبادی اربوں اور کھربوں کی تعداد تک پہنچتی ہے چوہوں میں، طوطوں میں، بندروں میں اور جانوروں سے گذر کر وحشی ترین، انسانوں میں وحدت و محبت بغیر کسی ترجمان۔ حقیقت یا ملت کے راگ الاپنے والے کے قائم ہے۔

اب اس کو کیا کیجئے کہ ازل سے ابد تک انسانوں میں محبت اور اور وحدت قائم کرنے کیلئے ہر ملک میں اور ہر دور میں پیغمبر پیدا ہوئے۔ یہاں تک کہ پوری انسانیت کے لئے حضور اکرم صلعم ہادی و رسول بنا کر بھیجے گئے۔ فراق خود غور کریں کہ انسان ان جانداروں سے جن سے کہ وہ اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کس حد تک بدتر یا بہتر ہے۔ میرا جہاں تک خیال ہے جتنے بھی پیغمبر پیدا ہوئے فراق کے نزدیک غیر ضروری تھے۔ اب فراق صاحب سے کیا بحث کیجئے؟۔

کلیم الدین صاحب "اقبال اور عالمی ادب" کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں۔

" اقبال کی شاعری کا زیادہ سے زیادہ حصہ پیغام ہے۔ نرا پیغام ہے یا تعلیم ہے، خالص تعلیم ہے۔ ظاہر ہے کہ عموماً پیغام کسی خاص فرقے کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن تعلیم کسی خاص وقت کے لئے موزوں ہوتی ہے یعنی اس میں وہ عالمگیری نہیں ہوتی، وہ پائیداری نہیں ہوتی، جو بزرگ شاعری میں ہوتی ہے۔"

بھلا بتلائیے اس انداز فکر کو کیا کریں۔ اصل میں کلیم الدین احمد صاحب کا ذہن محدودیت کا شکار ہے۔ وہ اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ پیام جہاں ایک فرقے کیلئے ہوتا ہے وہاں وہ پوری انسانیت کے لئے بھی ہوسکتا ہے۔ اور تعلیم جہاں کسی خاص وقت

کے لئے موزوں ہوسکتی ہے۔ وہاں وہ ہر وقت کے لئے مفید و موزوں بھی ہو سکتی ہے۔ اور انہوں نے جس "بزرگ شاعری کی طرف اشارہ فرمایا ہے غالباً ان کی اس سے مراد ان کی بیالیس ۴۲ نظمیں ہیں!! - کلیم الدین احمد صاحب نے مغربی افکار کے مطالعہ کے لئے جہاں عمر گذاری ہے کاش! وہ عمر عزیز کا ایک حصہ خود اسلام کو سمجھنے کے لئے وقف کئے ہوتے۔

اقبال نے اسلام کو ذہنی طور پر قبول کر کے اپنی افاقیت اور ہمہ گیری کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عالمی افکار اور جمیت اقوام پر پئے در پئے حملے کرتے ہیں۔ وہیں خود مسلمان بھی فریب کلیمی سے بچ نہیں سکتے۔ اقبال نے جمیت اقوام کی بیخ کنی کی ہے۔ اور جمعیت آدم کے تصور کو سیاسی سطح پر پیش کیا ہے، تو ایسی صورت میں وہ عربوں کے اندر پائے جانی والی عصبیت کو کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ اگر وہ تمام دنیا کے مسلمانوں سے کہتے ہیں ؎

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے ملّت کی نجات
ایشاء والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دین میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابہ خاکِ کاشغر

تو وہیں عربوں کو یوں ٹوکتے ہیں ؎

کرے یہ کافر ہندی بھی جرأت گفتار | اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو | وصال مصطفوی افتراق بولہبی
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا | محمدِ عربی سے ہے عالم عربی

اقبال نے برسوں پہلے جو نکتہ امرائے عرب کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، وہ آج کے موجودہ حالات میں کتنا زیادہ اہم بن گیا ہے، قابل غور ہے یہی کیفیت عالم انسانیت کی ہے۔ اقبال کی بصیرت نے عالمی سیاست کی جو بنیاد فراہم کی ہے۔ وہ احترام آدمیت ہے اور یہی اصل تہذیب بھی ہے اور یہ جذبہ مذہب کے بغیر انسانوں میں پرورش نہیں پاسکتا ؎

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال کے اس ہمہ گیر اور آفاقی نظریہ آدمیت کے پیش نظر اگر ہم انکی شاعری کا مطالعہ کریں تو اس شاعری کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اور پھر ہم اقبال پر محض مسلمانوں کی ہمنوائی کا الزام نہیں لگاتے برخلاف اس کے اقبال نے بنی نوع انسان کی فلاح، ان کے اتحاد، ان کی خوشحالی اور آزادی کا جو خواب دیکھا تھا اس کی حقیقت ہم پر روشن ہو جاتی ہے ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

ذاتِ رسالت

اقبالؔ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ عارف ہے، مجدّد ہے، محدث ہے یا کہ وہ فقیہہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کلام اقبالؔ میں معرفت، اجتہاد کے کثیرا ور حدیث اور فقہ کے بعض مسائل موجود ہیں۔ وہ بلا شبہ عارف نہیں تھے۔ لیکن معرفت کے رموز سے واقف تھے، وہ مجدد نہیں تھے لیکن اجتہاد کی اہمیت ان پر روشن تھی، وہ محدثین تھے لیکن حدیث پر اُن کی نظر تھی، اور وہ فقیہہ بھی نہیں تھے لیکن فقہ کے نکات اُن پر آشکار تھے۔ شائد اس لئے کہ وہ محرم رازِ درونِ میخانہ تھے! یا پھر اس لئے کہ ؎

راز حرم سے شائد اقبالؔ باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کہ انداز محرمانہ

اقبالؔ رازِ درونِ میخانہ اور واقف رازِ حرم ہونے کی وجہ سے ان کا اندازِ گفتگو محرمانہ تھا۔ انہوں نے حدیث و فقہ اور معرفت و اجتہاد ہی پر کیا منحصر ہے زندگی کے ہر مسئلہ پر اظہارِ خیال کیا، اور بے باکانہ انداز میں کیا ہے، اور ان کی یہ باکی عام انسانوں سے ہوتی تو اور بات ہوتی، بارگاہ خداوندی میں جاتے ہیں تو لہجہ میں وہی تلخی اور گرمی۔ شکوہ پڑھ لیجئے خود اندازہ ہو جائے گا۔

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اَے خدا! شکوۂ اربابِ وفا سن بھی لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ سن بھی لے

"شکوہ" اور "جواب شکوہ" سے گذر کر جب "بالِ جبریل" تک پہنچتے ہیں تو بے باکی

بڑھ کر گستاخی میں بدل جاتی ہے۔ کہنے کو تو غزل کا شعر ہے مگر انداز عاجزانہ کتنا ہے؟ ملاحظہ فرمائیں ؎

اگر کج رو ہے انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا
محمدؐ بھی تیرا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

پوری غزل اس قابل ہے کہ نقل کی جائے۔ اس گستاخی پر خود اقبالؒ کا ارشاد ہوتا ہے ؎

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

حضرت یزداں کی بارگاہ سے اکھڑ کر آنے والا یہی بندۂ گستاخ جب بارگاہ رسالت مآبؐ میں حاضر ہوتا ہے تو تیور بدل جاتے ہیں اور لہجہ میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ لفظ لفظ سے عقیدت و محبت کی بارش ہوتی ہے ؎

کرم اے شہ عرب و عجم کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغ سکندری

میرے خیال میں جو لوگ خدا سے محبت کرتے ہیں وہ صرف خدا سے محبت رکھتے ہیں لیکن جو لوگ رسولؐ سے محبت کا اظہار کرتے ہیں وہ رسولؐ اور خدا سے بھی محبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ خدا خود اپنے محبوب کی محبت میں گرفتار ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے "جس نے محمدؐ کو چاہا اس نے مجھے چاہا" اور یہی وہ مقام صد افتخار ہے جہاں کھڑے ہو کر رسول عربیؐ فرماتے ہیں۔

"میں اللہ کے نور سے ہوں، اور تمام مخلوق میرے نور سے"

پہلے تو نورِ محمدؐ پیدا ہوا پھر خدا کو کائنات کی تخلیق کا خیال آیا حکم ہوا کُنْ فَیَکُوْنُ اور کائنات وجود میں آئی۔ جب کائنات وجود میں آئی تو باری تعالیٰ ذاتِ رسالتمآب سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے ؎ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (اگر آپ نہ ہوتے تو میں دنیا کو پیدا نہ کرتا) اقبالؔ کو خدا کی کمزوری معلوم ہوئی تو انہوں نے خوب خوب گستاخی کی، لیکن محمدؐ کے دامن کو پکڑے رہے۔ اقبالؔ کے اس طور سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ذاتِ رسالتمآب کے شفیع ہونے پر کتنا یقین تھا۔ تب ہی تو شہ عرب و عجم کے حضور عجز و انکساری کے مجسم بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اپنی نسبت فرماتے ہیں ؎

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تو فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترا امیدزبوں! فرشتہ و حور کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

اور اس نسبت پر اقبالؔ کو ناز بھی ہے۔ چنانچہ اقبالؔ کا سارا کلام اسی عشق محمدیؐ کی منظوم تفسیر ہے۔ اس لئے میرے نزدیک اس لئے میرے نزدیک اقبال نہ تو مفکر ہیں اور نہ مدبّر وہ فلسفی ہیں نہ شاعر۔ وہ صرف شمع محمدیؐ کا پروانہ ہیں، اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں ؎

عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب

گویا یہ سرمدی آواز تھی جو پہلی مرتبہ اردو شاعری میں بلند ہوئی۔ اردو شاعری میں نعت گوئی کا آغاز روزِ اوّل ہی سے ہوا ہے۔ اردو کے قدیم و جدید شعراء نے چاہے انکا مذہب کچھ بھی ہو ذاتِ رسالتمآب سے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اسطرح نعت گوئی ایک روایت بن گئی۔ اس حد تک کہ عشقیہ مثنویاں لکھنے والے شعراء نے بھی حمد و نعت ہی سے مثنویاں کا آغاز کیا ہے۔ ہم کو حیرت تو

اس وقت اور زیادہ ہوتی ہے، جب مجازی عشق میں گرفتار شاعر محمد قلی قطب شاہ اپنی غزل کی ابتدا یا آخر میں محمدؐ سے یا علیؑ سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتا ہے۔ گویا اس زمانہ کا کلام کثافت اور لطافت کا عجیب و غریب امتزاج ہوتا تھا۔ ان قدیم شعراء میں نصرتی کی استثنائی صورت ہے۔ اگر آپ علی نامہ اور تاریخ اسکندری پڑھیں تو حمد کے ساتھ ساتھ نعت کے بھی بدلے ہوئے انداز میں پائینگے جہاں روایتی عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ شان خداوندی کے ساتھ شان محمدیؐ کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ اس عقیدت اور شاعری میں ایک قسم کی یکسانیت اور ہم آہنگی بھی ملتی ہے۔ نصرتی کے بعد حالی کی ذات اپنے دور کے روایات سے بغاوت کرتی ہے۔ اقبال نے تو نعت کو روایت کے بجائے حقیقت بنا دیا اور نعت گوئی کو مریضانہ تصوّر سے نجات دلا کر انقلابی لب و لہجہ عطا کیا ہے۔ اقبال کا یہ ایسا عظیم کارنامہ ہے جس کی طرف نقادوں اور اقبال کے مفسروں نے کم ہی توجہ دی ہے۔ اقبال نے ذات رسالتمآب سے اپنی بے پناہ عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ اظہار ظاہری صورت و شکل اور معجزات تک محدود نہیں ہے۔ اقبال نے ذات سے زیادہ صفات سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ رسالت آبؐ کی ذات بابرکات محض پوجے جانے اور درود و سلام بھیجے جانے کیلئے نہیں بلکہ عملی زندگی میں اکتساب فیض کرنے کے لئے ہے۔ ذاتؐ سے یہ عشق قوائے ذہنی کو مضمحل اور ناکارہ نہیں بناتا بلکہ ایک نئے انقلاب کی قوت و طاقت عطا کرتا ہے۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

اقبال نے میلاد النبیؐ سے متعلق ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ یاد رسولؐ اس کثرت سے اور ایسے انداز سے کی جائے کہ انسان کا قلب نبوت کے مختلف پہلوؤں کا خود

ٹھہر جائے۔ یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے جو کیفیت حضور سرورِ عالم[۲] کے
وجودِ مقدس سے ہویدا تھی وہ آج تمہارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے۔
حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؂

آدمی دیدست باقی پوست است
دید آنست آنکہ دیدِ دوست است

جوہرِ انسانی کا انتہائی کمال ہے کہ اسے دوست کے سوا اور کسی چیز کی
دید سے مطلب نہ رہے۔" چنانچہ اسی وجہ سے اقبالؔ عشقِ رسول[۲] کو مومن
کی اصلی پہچان قرار دیتے ہیں

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں وہ جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

جو صاحبِ لولاک ہے وہی مومن بھی ہے اور اسی مومنِ جانباز کی میراث یہ
سارا عالم ہے۔ اقبالؔ کی شاعری کا جائزہ لیں تو حرکت، وعمل، عقل و عشق
علم و حکمت اور خودی اور بیخودی کے سارے فلسفے ایک ہی ذات میں آکر
مرکوز ہو جاتے ہیں۔ اور اسی طرح اقبال کی سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی
فکر کا نقطۂ آغاز و آخر یہی ذات بابرکت[۲] قرار پاتی ہے۔ اسی منزل پر پہنچ کر
اقبالؔ کہہ اٹھتے ہیں

وہ دانائے سُبل ختم الرُسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین وہی طٰہٰ

ذاتِ رسالتمآب[۲] سے عقیدت و محبت کی بے پناہ مثالیں تاریخ اسلام میں ملتی

ہیں۔ لیکن اقبال کا یہ والہانہ انداز شاید ہی کہیں ملتا ہو۔ اقبال کے کلام میں مجہول و مفلوج عقیدت کے بجائے ایک طرحداری ہے۔ وہ نہیں کہتے کہ ہم خوار ہیں بدخوار ہیں پھر بھی تیری محبوب کی امت سے ہیں۔ بلکہ ہر ہر لمحہ وہ زندگی کے ہر موڑ پر ذات رسالتمآب ؐ سے رہبری و رہنمائی کی درخواست کرتے ہیں ؎

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
میری دانش ہے افرنگی، میرا ایمان ہے زناری

یا پھر یہ کہ ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اقبال نے خاک مدینہ کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنایا تھا۔ اس لئے جلوۂ دانش افرنگ ان کو خیرہ نہ کر سکی۔ اس سلسلے کی نظموں میں، اے رُوح محمدؐ بلاد اسلامیہ نبوت اور غزلوں کے بیشتر اشعار کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ اقبال جب یہ کہتے ہیں کہ ؎

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

اس کا سادہ سا مطلب یہی ہے۔ چونکہ ساری دنیا کو خدا نے حضور ہی کی خاطر پیدا کیا۔ اس لئے حضور کی وساطت سے ہر مرد مومن خطاب لولاک کا مستحق ہے۔ اور اس کی رُو سے تمام جہاں مرد مومن کی میراث ہے۔ یہ زمین ہی نہیں بلکہ آسمان بھی عالم بشریت کے زد میں ہے

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اسی ایقان بلکہ یقین محکم کے تابع اقبالؔ اپنے ہر مسئلہ کو ذات رسالتمآب سے رجوع کرتے ہیں، اور جب وہ ذات رسالتمآبؐ کو قرآن، فرقان، یٰسین اور طاہا قرار دیتے ہیں تو اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اس ذات بابرکتؐ کی روشنی میں ہم اپنی زندگیوں کو سنواریں، سدھاریں۔ اقبالؔ نے جس مرد مومن کا تصور اپنے کلام میں پیش کیا ہے وہ محض فرضی نہیں ہے۔ اور نہ وہ مستقبل میں ایسے کسی مرد مومن کی تخلیق چاہتے ہیں۔ جو لوگ اقبالؔ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے نیٹشے سے مرد مومن کے تصوّر کو مستعار لیا ہے۔ اصل میں وہ نہ تو نیٹشے کو سمجھے ہیں اور اور نہ ہی اقبالؔ کو۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ اقبالؔ نے ذات رسالتمآبؐ میں ایک مکمل انسان کی ساری خوبیوں کو مجتمع ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس لئے، وہ چاہتے تھے یہی خصوصیات ہر امتی میں پیدا ہوں۔ اس طرح اسلام ایسے جانبازوں اور مردان ہنرمند کا مرکز بن جائے۔ چنانچہ ان کی خواہش کا اظہار ان کی نظم حضور رسالت مآب میں یوں ہوتا ہے ؎

کہا حضور نے اے عندلیب باغ حجاز ۔۔۔ کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز

ہمیشہ سرخوشِ جام ولا ہے دل تیرا ۔۔۔ فتادگی ہے تیری غیرت سجود و نیاز

اڑا جو پستی دنیا سے تو سوئے گردوں ۔۔۔ سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعت پرواز

نکل کے باغ جہاں سے برنگ بُو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

حضورؐ دہر میں آسودگی نہیں ملتی ۔۔۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں ۔۔۔ وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں ۔۔۔ جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں ۔۔۔ طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

مردِ مسلمان کی پہچان کیا ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن ۔۔۔ گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت ۔۔۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

مختصر یہ کہ ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اقبالؔ نے ذات رسالتمآب کو ہی نہیں، مسلمان قاری کو بھی قرآن قرار دیا ہے یہ افتخار محض اُمت محمدیؐ ہی کو حاصل ہو سکتا ہے، کسی اور کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اقبالؔ کی اُمیدوں کا مرکز بن جاتے ہیں، اور ان کی بہتری اور اصلاح کی فکر انہیں ستانے لگتی ہے یہ محض کسی عصبیت کا نتیجہ نہیں بلکہ اقبالؔ کی اس ہمہ گیر اور عالمی فکر کا نتیجہ ہے۔ جس کی مدد سے وہ دنیا کے انسانوں کو ایک اور نیک دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ خود مسلمانوں کا شیرازہ ابتر ہے تو وہ ذات رسالتمآب سے پوچھ بیٹھتے ہیں ؎

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

اقبالؔ نے عالمی برادری، اخوت مساوات، انصاف و آزادی اور جمعیت آدم جو خواب دیکھا تھا۔ اس کی حقیقی صورت گری کے لئے اقوام عالم میں انہیں ایک ذات ایسی نظر آئی جس کی روشن زندگی کو مشعل راہ بنا کر اس خواب کو حقیقت میں بدل لیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ عشق محمدیؐ کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ اس آگ کی چنگاریاں مسلمانوں میں ابھی تک

بھی باقی ہیں۔ اس لئے وہ سوئے ہوئے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ اقبالؔ کو ذات رسالتمآب سے بے پناہ عشق ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی عشق کے نتیجہ میں اُمت محمدیؐ کا ہر فرد انہیں عزیز ہے۔ لیکن اقبالؔ کی یہ محبت نتیجہ ہے اس محبت کا جو ان کے دل میں آدم کے تعلق سے ہے یہاں ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ اقبالؔ کو انسانی تہذیب صرف مسلمانوں کے ہاتھوں میں محفوظ نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ رسالتمآبؐ کی ذات اور عام مسلمانوں سے باربار خطاب کرتے ہیں، اور اپنی بے پناہ عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے اقبالؔ کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

" اپنے ایک بلند پایہ خط میں اس حقیقت کی تشریح کے لئے ایک بلیغ مثال دی ہے کہ مسلمانوں کے انتہائی غلبہ اور طاقت کے زمانے میں حبش کی آزادی محفوظ رہی لیکن میسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا تھا۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ میسولینی کی خودی کسی آئین مسلم کی پابند نہ تھی۔ اور دوسری صورت میں خودی قانون الہٰی آدم اخلاق کی پابند تھی۔ انسانیت کے اجتماعی مفاد کی حفاظت اور اس کے احترام کی یہی راہ ہے ۹

اصل تہذیب احترام آدم است "

اقبالؔ دنیا کے تمام فلسفوں اور نظریوں کا بغائر مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سوائے ذات رسالتمآبؐ کے اصل تہذیب کی تعلیم کہیں اور نہیں ملتی تو وہ دست بستہ کھڑے ہو کر عرض کرتے ہیں۔

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم

اقبالؔ کے لئے ذات رسالتمآبؐ فکر و خیال کی روشنیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک ایسی ذات ہے جس کا اسوہ حسنہ اقوام عالم کے سامنے ہے

اقبالؔ کو حضور کے ظاہری خدوخال سے یقیناً بے پناہ محبت ہے۔ لیکن ان کی نظر باطن پر جمی ہوئی ہے۔ جو قوت اور طاقت، محبت و شرافت، اخلاق و مروت اور انسانیت کا اتاہ سمندر ہے اور موجزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ذات رسالتمآبؐ سے بے پناہ عشق کا والہانہ اظہار کرتے ہیں، اور پھر یہ عشق کیا ہے؟ انسان کو عزلت نشین نہیں بناتا کارگہ عالم میں نئی قوت نئی طاقت بخشتا ہے۔ مرد خدا کا عمل اسی عشق سے صاحب فروغ ہے، عشق ہی اصل حیات ہے۔ جس پر موت حرام ہے۔ گو زمانہ کی رَو تند و سبک سیر ہے، لیکن عشق خود ایک ایسا سیل ہے جو زمانے کے سیل کو تھام لیتا ہے۔ عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا اور زمانے بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں۔ اقبال اسی عشق میں ڈوب کر کہتے ہیں کہ عشق دم جبریل بھی ہے اور عشق دل مصطفیٰ بھی، عشق خدا کا رسول بھی ہے عشق خدا کا کلام بھی، عشق صہبائے خام بھی اور عشق کاس الکرام بھی، عشق فقیہہ حرم بھی ہے اور عشق امیر جنود بھی اور عشق ابن السبیل ہے۔ جس کے ہزاروں مقام ہیں۔ مختصر یہ کہ :-

عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات　　عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات

وحید قادری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ علامہ اقبالؔ کو ذات رسالتمآبؐ سے غیر معمولی عشق و حمیت تھی۔ اُن کا حکیمانہ دل و دماغ نے یہ محسوس کر لیا کہ حُبّ نبوی کے بغیر سارا علم و عمل حجاب ہی حجاب ہے کیونکہ انسانیت کی حقیقی تعمیر کے لئے جس فکر و عمل کی ضرورت ہے اس کا منبع اور مرکز ذاتِ رسالت مآب ہی ہے :-

این ہمہ از لطف بے پایاں تو　　فکر ما پروردۂ احسان تو

(سب کچھ آپ کی عنایت بے پایاں ہی سے حاصل ہوا۔ ہماری فکر آپؐ کی آغوشِ احسان کی پروردہ ہے۔)

اقبالؔ جب بانگ درا، بال جبریل اور ضرب کلیم کی منزلوں سے گذر کر ارمغان حجاز تک پہنچے ہیں تو ذات رسالتمآبؐ کیلئے جو جوش اور ولولہ موجود تھا، اس میں تڑپ اور درد بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی ان کے اندر دیار حبیبؐ کی زیارت کی آرزو پیدا کر دیتی ہے اور یہی "بندۂ گستاخ" عشق محمدی کی وجہ سے تڑپ کر خدا سے مخاطب ہوتا ہے ؎

بدن وا ماندہ و جانم در تگ و پوست ۔۔۔ سوئے شہرے کہ بطحا در رہ اوست

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز ۔۔۔ کہ من دارم ہوائے منزل دوست

(آپ تو یہیں کعبہ میں رہ کر اپنے خاص بندوں سے ملئے، لیکن مجھے تو منزل دوست کی تمنا ہے اور اسی لئے میں مدینہ جا رہا ہوں) مدینہ سے محبت کا اظہار کرکے اقبالؔ نے خاک مدینہ کو محض مقدس و محترم نہیں کہا ہے، بلکہ اس کو مسلم کا ماوی سمجھتا ہے قومیت اسلام کا وہ مقام جو آگے چل کر بنی نوع انسان کا مرکز بننے والا ہے۔ چنانچہ اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں "بلاد اسلامیہ" کی سیر کرتے ہوئے خوابگاہ مصطفےٰ کے بارے میں کہا تھا ؎

وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہ مصطفےٰؐ ۔۔۔ دید ہے کعبے کو تیری حج اکبر سے سوا

خاتم ہستی میں تو تاباں ہے مانند نگیں ۔۔۔ اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں

تجھ میں راحت اس شہنشاہ معظم کو ملی ۔۔۔ جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی

نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے ۔۔۔ جانشیں قیصر کے، وارث مسند جم کے ہوئے

ہے اگر قومیت اسلام پابند مقام ۔۔۔ ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو ۔۔۔ نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں!

گو اقبال کو حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی، لیکن جو زاد راہ انہوں نے اپنے لئے تیار کر لیا تھا، وہ ارمغان کی صورت ہمارے لئے چھوڑ گئے، اور جاتے جاتے ایک بصیرت افروز نکتہ بیان کر گئے، جو آج بھی مسلمانوں کو دعوت فکر دے رہا ہے ؎

عصرِ حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہ تمام
وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

○

حضرتِ انسان

٥

انسان روزِ اول ہی سے محبوب و معتوب رہا ہے۔ اس کی تخلیق خدا کی محبوبیت کا نتیجہ تھی، اور جب وہ ابلیس کے بہکاوے میں آگیا تو معتوب ٹھہرا۔ لیکن اس عتاب میں بھی شانِ محبوبیت غالب رہی۔ جنت سے نکالا جانے والا انسان اشرف المخلوقات کہلایا اور نیابتِ الٰہی کا مستحق بھی قرار پایا، اور ایک نئی دنیا ایک نئی زندگی سے بھی آشنا ہوا۔ اقبالؔ کے کلام میں انسان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اقبالؔ تخلیقِ آدم کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ اور وہ خالق و مخلوق کے رشتۂ باہمی سے بھی خوب واقف ہے۔ اس سلسلے میں اس کی تین نظمیں راست طور پر "انسان" سے متعلق ہیں۔

بانگِ درا میں جو نظم انسان ہے۔ اس میں قدرت کی اس ستم ظریفی کو ظاہر کیا ہے کہ خدا نے انسان کو ایک راز بنا کر پیدا کیا، اور اس پر ستم یہ کہ کائنات کی حقیقت کو اس سے چھپایا گیا۔ زندگی کی اس حقیقت کو پانے کا ذوق انسان کو بے تاب و بے چین کر دیتا ہے۔ گویا جستجو اور تلاش ہی اس کا مقدر ہے اور اس جستجو اور تلاش میں وہ تنہا ہے۔

کوئی نہیں غمگسارِ انساں
کیا تلخ ہے روزگارِ انساں

اسی مجموعہ کی دوسری نظم میں اقبالؔ نے ان ہی جذبات و احساسات کا اظہار کیا، لیکن یہاں انسان کے اندر جو تلاش کرنے اور کچھ پانے کی جو صلاحیت ہے

اسکا وہ اظہار کرتا ہے۔ انسان مجبور محض نہیں ہے۔ وہ یقیناً اپنے خدا کے ساتھ مجبور اور بے بس ہے۔ لیکن کائنات اور اس کی اپنی زندگی اسی کے تابع ہے۔ انسان کی ہر قوت، سرگرم تقاضہ ہے! انسان اقبال کے بارے میں کہتا ہے ؎

اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرہ نہیں، شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی
یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

انسان کو جب اپنی قوت کا اندازہ ہوتا ہے تو کائنات کو جس میں زمین آسمان اور سمندر شامل ہیں فتح کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتا ہے۔ بلکہ لہجہ گستاخانہ ہو جاتا ہے۔

اگر مقصود کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
مرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے

منشاء خداوندی بھی یہی ہے کہ انسان بحر و بر کا علم حاصل کرے۔ وہ آسمان اور زمین میں دولت چھپی ہے، اپنی اسی تلاش و جستجو کے ذریعہ اپنے تصرف میں لائے۔ قرآن کریم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان ہی ذخیروں کی طرف اشارہ کیا ہے، جو انسان کے فائدے کیلئے مسخر کئے گئے ہیں

کیا تم نہیں دیکھتے کہ خدا نے جو زمین میں ہے وہ تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے
(۲۲: ۶۷)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں تمہارے لئے خدا نے مسخر کر دیں
(۳۱: ۱۹)

تمہارے لئے دریا کو مسخر کر دیا تاکہ اس میں خدا کے حکم سے کشتیاں چلیں

اور اپنے رزق کو تلاش کرو۔ (۱۱ : ۸۵)

خدا نے انسان کے لئے ساری مخلوقات کو تابع کیا، پہاڑ کو، آفتاب و ماہتاب کو حد تو یہ کہ رات، دن، چاند، سورج سب اس کے تابع کر دے گئے۔ اس حقیقت سے جہاں حضرت انسان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے وہیں اس کے علم، قوت اور ذوق جستجو کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ افسوس اس بات پر نہیں کہ انسان اِن نعمتوں سے محروم ہے بلکہ افسوس اس کا ہے کہ وہ اپنی، قوت و طاقت سے واقف نہیں ہے۔ اقبال کی ساری جستجو یہی ہے کہ وہ حضرت انسان کو اسی کی اپنی قوت و صلاحیت سے واقف کرائے۔ فلسفۂ خودی کی حقیقت بھی بس اتنی سی ہے۔ اقبال انسان کو خودی کا جو درس دیتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ وہ انسان خصوصاً مسلمانوں کو اس دولت بیش بہا سے مالا مال کر دینا چاہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک انسانی معاشرہ کی گراوٹ کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنی خودی سے آگاہ نہیں ہے ؎

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی انکھوں پر عیاں ہو جا
خود کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

عالم خوندمیری نے "فکر اقبال" کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے۔ "اقبال کی فکر ایسے ہی افراد کیلئے ہے۔ جو واقعی شخصیت کے حصول کے طلبگار ہیں۔ ان لوگوں کے لئے اس کے میخانے میں کوئی گنجائش نہیں جو ازل کا سرور حاصل کرتے ہیں اور جنھیں ابد کی فکر نہیں"۔

اقبال نے ایسے افراد کی بھی فکر کی ہے جو ازل اور ابد سے لاپرواہ زندگی کے صحرا میں بھٹک رہے ہیں۔ اقبال کے مخاطب اصل میں وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو یا تو پہچانا نہیں ہے یا جو محض زندگی سے فرار

اختیار کرتے ہیں ۔ اقبالؔ کے نزدیک ایک عام انسان، عام انسان ہوتے ہوئے بھی ایک خاص انسان ہے ۔ جسے وہ فوق البشر یا مرد مومن دیکھنا چاہتا ہے ۔ ایک عام انسان اپنی خودی کے ذریعہ مرد مومن کے مرتبہ کو حاصل کرسکتا ہے ۔ خودی محض خود اعتمادی، خودداری اور خود کی پنہاں صلاحیتوں کو پہچاننا ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک فلسفہ ہے، یہ ایک فلسفہ ہی نہیں ہے ایک مسلک بھی ہے ۔ خودی کی تربیت کے تین مرحلے اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی ہیں اللہ تبارک تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو جو سب سے بڑی ذمہ داری سونپی ہے وہ نیابت ہی ہے ۔

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا ۔

اس کام کا اہل ہر وہ عام انسان ہوسکتا ہے جو اپنی خودی کے ذریعہ اس مرتبہ و مقام کا خود کو اہل ثابت کرتا ہے ۔ اقبالؔ نے تو انسانوں کے درمیان کے کسی بھی قسم کی تخصیص کو مٹایا ہے اور یکساں طور پر اپنی خودی کی تعلیم دیتا ہے اس کے میخانے میں سب انسان برابر ہیں

بلاشبہ اقبالؔ شاعر فطرت بھی ہے اور شاعر فلسفہ بھی۔ خودی کا یہ پرستار بے خودی میں ڈوب جانے کی تلقین کرتا ہے ۔ علم و عشق کے معرکے عشق کی حاکمیت پر زور دیتا ہے ۔ زمان و مکان کا نیا حرکی نقطۂ نظر پیش کرتا ہے ۔ جبر و قدر کے مسائل پر گہری نظر رکھتا ہے ۔ اور اسی حیثیت سے اقبالؔ کی شاعری کا تجزیہ کیا جاتا رہا ہے ۔ اشفاق حسین نے دیگر مفسرین اور ناقدین کی طرح فلسفہ اور تاریخ کی روشنی میں کلام اقبال کا مطالعہ کیا ۔ ان کی کوشش یہ رہی کہ خدا، انسان اور کائنات کا باہمی رشتہ کیا ہے، جان سکیں ۔ اقبالؔ کی شاعری کا مرکزی نقطہ خدا، کائنات، انسان کے

باہمی رابطہ و تعلق کو پہچاننا ہی ہے ۔ سچے اور اچھے علم کا ابلاغ بھی اقبال کی ساری بڑائی اسی میں ہے کہ اس نے اپنے کلام کے ذریعہ انسان کو خودی کی تعلیم دی ، اور بے پناہ قوت تخلیق سے آگاہ کیا ، تاکہ وہ تو عشق سے کائنات کی تسخیر کرے اور کائنات کو مناسب انداز میں اس لئے کہ وہ اپنے برتاؤ کیلئے خدا کے سامنے جوابدہ بھی ہے ۔ اشفاق حسین نے اپنی تصنیف " اقبال اور انسان " میں اسی نقطہ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں !

" ان اوراق کا مقصد ان مختلف گوشہ ہائے افکار کا تفصیلی مطالعہ نہیں بلکہ ان راہوں کی نشاندہی مقصود ہے ۔ جن پر فکر و خیال کے قافلے انسانیت کی تلاش و جستجو میں سرگرم سفر ہوئے ہیں ۔"

سچ تو یہ ہے کہ اشفاق حسین نے " مقام اقبالؒ " میں اقبالؔ کے مقام کا تعین کرتے کرتے اقبال کو تلاش کر لیا ہے ۔ جب کہ " اقبالؔ اور انسانؒ " میں اقبالؔ اور تصوّر انسانیت سے بحث کرتے کرتے انسان کو تلاش کر لیا گیا ہے

اقبالؔ جس عہد کی عکاسی کر رہا تھا وہ عہد جدید سے کچھ مختلف نہیں تھا قومی اور بین سطح پر نفرت و حقارت اور جنگ و جدل کی وہی کیفیت تھی جو آج ہے آج صرف یہ ہوا ہے کہ نام بدل گئے ہیں ۔ میسولینی ، ہٹلر اور نپولین کل بھی تھے اور آج بھی ہیں ۔ انسان کل بھی مظلوم تھا آج بھی ہے ۔ اللہ کی زمین کل بھی خون آلود تھی ، آج بھی ہے ۔ انسانی اقدار کا جہاں تک سوال ہے وہ کل بھی پائمال تھے اور آج بھی تاراج ہیں ! یہ سب اس وجہ سے ہے کہ انسان کے اندر شر ، فساد اور بہیمیت کی خصوصیات ہیں وہ قابو میں نہیں ہیں ۔ انسان خود اپنی برائیوں کے سامنے مجبور و بے بس ہے ۔ دنیا میں پھیلی اس بہیمیت اور

خونریزی کا واحد علاج یہی کہ انسان اپنے شر پر قابو پائے۔ اس شر پر قابو پانے کا نام بھی خودی ہے۔ خودی ایک ایسی طاقت ہے۔ جس کی مدد سے انسان اپنی ہر کمزوری کا تدارک کر سکتا ہے۔ وہ خودی کے ذریعہ جہاں جہاں کی ہیئت بدل سکتا ہے۔ وہیں وہ اپنی ذات میں بنیادی تبدیلیاں بھی پیدا کر سکتا ہے خودی انسان کے ہاتھ میں ہتیار ہے۔ اس ہتیار سے وہ اس شیطان کو مار سکتا ہے جو اس کے اندر ہے۔ اور اس شیطان کو بھی جو کائنات میں تباہی اور درندگی کا کھیل کھیل رہا ہے۔

اقبال کہتا ہے ؎

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے، مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی

بشرطیکہ انسان کو خودی کی معرفت ہو جائے۔ اور اگر اس معرفت ایک بار ہو گئی تو پھر ؎ خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں!

اقبال خودی کی حقیقت کو پا گیا تھا۔ اس نے اس حقیقت کو اپنے کلام کے ذریعہ عام کرنے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی شاعری کے بارے میں کہا ؎

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
ایک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

خودی کے علاوہ اقبال نے عقل، عشق اور فقر پر بھی زور دیا ہے۔ خصوصاً عقل و عشق پر مضامین خوب خوب باندھے ہیں حالانکہ یہ فقر، عقل و عشق

خودی کے ستواری کوئی علحدہ اصطلاحیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایسے تین ستون ہیں، جن پر خودی کی تعمیر ہوئی ہے۔ حد تو یہ کہ اقبالؔ نے خودی کو اسلام اور اسلام کا خودی نام دیا ہے ؎

روح اسلام کی ہے نورِ خودی، نارِ خودی
زندگانی کیلئے نارِ خودی، نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم، یہی اصل نمود
گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور

اور یہی خودی حیات ابدی بھی ہے ؎

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
یہ صدف کیا ہے جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

انسان کی صلاحیتوں میں عقل و دانش بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ عقل کے بغیر زندگی کا تصور بے معنی ہے۔ اقبالؔ نے عقل کو اس کا مستحق مقام دیا ہے لیکن وہ دل کی قوت کے زیادہ قائل ہیں۔ اس ضمن میں "عقل و دل" اقبالؔ کے تصوّر کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا | بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر، گذر فلک پہ مرا | دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
عقل تجھ کو خضر راہ بتاتی ہے اور مجھتی ہے کہ میں ہی مظہر شان کبریا ہوں میں

ہی مفسر کتاب حیات ہوں ۔ اور وہ دل کو حقارت آمیز انداز میں مخاطب ہو کر اسے خون کی ایک بوند کہتی ہے ۔ جبکہ وہ غیرت لعل بے بہا ہے ۔ دل اس کی ان باتوں کو سن کر جواب دیتا ہے ؎

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جو، خدا نما ہوں میں

اور پھر دل عقل سے اس کے مقام کا پتہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ؎

عرش رب جلیل کا ہوں میں

گویا اقبال نے عقل کو آئینہ دکھا دیا ۔ عقل کی دل کے مقابلے میں کم حیثیت قرار پانے کے نتیجہ میں اقبال اکثر اوقات اسے تنہا چھوڑ دینا چاہتا ہے ۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں　　عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عشق خودی کی تعمیر میں کلیدی حصہ ادا کرتا ہے ۔ اقبال کے یہاں عشق ایک قوت و طاقت ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ؎

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

اقبال نے عشق کو دم جبریل بھی قرار دیا ہے، دل مصطفٰے[۲] بھی، عشق خدا کا رسول ہے ۔ عشق خدا کا کلام بھی، عشق فقیہہ حرم ہے ۔ اور عشق امیر جنود بھی عشق صادق خلیل بھی ہے ۔ اور عشق صبر حسینؓ بھی ؎

معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

حد تو یہ کہ
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

جب انسان جذبۂ عشق سے سرشار ہوتا ہے تو وہ اس قابل ہوتا ہے کہ زمین و آسمان اور سمندر کے اندر جو دولت اس کے لئے مسخر کی گئی ہے اس سے استفادہ کر سکے۔ عشق یہاں ایک روایتی جذبہ نہیں ہے جو انسان کو مثل پروانہ شمع کے گرد گھومنے اور جل مرنے پر اکساتا ہے بلکہ اس کے اندر زندگی کی روشنی کی آرزو کو جگاتا ہے۔ اپنے اس خیال کو اقبال نے "شمع و پروانہ" میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ ظ۔ انصاری نے نتاشا گا کے حوالے سے کہا ہے کہ اقبال "انسانی شخصیت کا الوسیلہ میں فنا ہونا نہیں چاہتے بلکہ نورِ الٰہی جذب کر کے اس کی جداگانہ زندگی چاہتے ہیں۔ عشق کی فتح اس میں ہے کہ وہ انسان کی روح میں نور کی تمنا جگا دے اور بقا کی طرف لے جائے" انسان جب نور سے اکتساب کرتا ہے تو اس کی ذات روشن ہو جاتی ہے، اور اس کے خوابیدہ صلاحیتیں اُبھر آتی ہیں جو خدا سے منسوب ہیں وہ انہی معنوں میں بندۂ مولا صفات کہلاتا ہے۔ جب اللہ کی صفات اس کی ذات کا حصہ بن جاتی ہیں، تو وہ سراپا خیر ہی خیر بن جاتا ہے۔ اقبال نے ایسے ہی انسان کو "مردِ مومن" کا نام دیا ہے۔ مسجد قرطبہ میں اقبال نے مردِ مومن کے اوصاف حمیدہ کا بڑے ہی خوبصورت انداز میں ذکر کیا ہے۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اسکی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم
اسکا سرور اسکا شوق اسکا نیاز اس کا ناز

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

جس طرح قرآن حکیم کا مخاطب ایک انسان ہے۔ اسی طرح اقبال نے بھی انسان ہی کو مخاطب کیا ہے۔ ایک انسان کی تربیت، اس کی تعلیم ہی قرآن حکیم کا بھی اور قرآن اور سنّت کی روشنی میں کلام اقبال کا مقصد ہے۔ اقبالؔ نے بھی کہا تھا کہ جب وہ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہی قرآن حکیم کے مخاطب ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم کلام اقبالؔ کو بھی اسی انداز سے پڑھیں اور سمجھیں تو یقیناً اس کلام کا اثر ہمارے دل و دماغ پر ہوگا۔ راست اور گہرا۔!

مردِ مومن محض ایک تصوّر ہی نہیں ہے۔ اقبالؔ نے پیغمبرِ اسلام آنحضرت محمد مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ان تمام صفات کو مجسم دیکھا ہے۔ یہ ایک انسان کی تکمیل کی صورت ہے۔ جو جذبہ عشق کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ خودی کی تکمیل کی اعلیٰ ترین صورت بھی ہے۔ جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں ایک عام انسان کی اعلیٰ ترین تربیت کا اہتمام و انصرام کیا ہے۔ اس کی تقلید میں اور قرآن

مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام - جمعیتِ آدم

اقبالؔ نے اپنے عہد میں جنیوا کانفرنس کا حال دیکھا اور آج ہم اقوام متحدہ کا انجام بھی دیکھ رہے ہیں۔ تاریخ ہیروشیما کی تباہی کو دیکھ چکی ہے اور آج ہم فلسطین کو برباد ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ بوسینیا پر مظالم آج بھی جاری ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلام عالمی بھائی چارہ اور وحدت و اخوت کا جو درس دیا ہے وہ جب تک عام نہیں ہوتا، انسان انسان کا اسی طرح دشمن بنا رہے گا۔

قیامت ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکاری ہے!

اقبالؔ نے مسلمان کی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا تھا۔ اس کی بنیاد کی وجہ یہی تھی کہ وہ پہلے خود سنبھل جائے، وہ سنبھلے گا تو جمعیت آدم سنبھلے گی! اس غرض کے لئے اقبالؔ نے اپنے فلسفۂ خودی سے کام لیا ہے۔ ایک جگہ اقبالؔ نے کہا تھا۔

"جو کسی ناسازگار ماحول کو بدلنا چاہتا ہے۔ اُسے خود اپنے اندر مکمل انقلاب پیدا کرنا ہوگا۔ اپنی آزاد اندرونی زندگی پر ایک مضبوط عقیدے کے بغیر کسی مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔ اگر تم اپنی آرزوں کو بارآور دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی ساری خودی کو اپنی ذات میں مرکوز کر دو"

خودی کا مقصود کیا ہے اقبالؔ نے بتا دیا، اقبالؔ ہی کی زبان سے سنئے، خودی کیا ہے۔؟

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے

و سنت رسولؐ کی پیروی میں اقبالؔ نے ایک عام انسان کی ذہنی و قلبی تعمیر کا بیڑا اٹھایا ہے اقبالؔ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ نہ تو عارف ہے، نہ مجدّد، نہ محدث نہ فقیہہ، اور نہ اس نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ مقام نبوت سے آگاہی رکھتا ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ عالم اسلام پر نظر رکھتا ہے اور وہ زمانے کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

عصرِ حاضر کی شبِ تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفت ماہِ تمام
"وہ نبوت ہے مسلماں کیلئے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام"

اقبالؔ ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کی زبوں حالی پر تڑپ اٹھتا ہے۔ اقبالؔ نے اکثر و بیشتر مسلمان کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ تنگ نظر اور متعصب تھا بلکہ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتا رہا کہ مسلمان کی بیداری عالم انسانیت کی بیداری ہے۔ مسلمان چونکہ ایک ضابطہ حیات رکھتا ہے جو بنی نوعِ انسان کی فلاح کا ضامن ہے، اس لئے پہلے وہ مسلمان کی اصلاح ضروری سمجھتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک عالمی اور آفاقی مذہب ہے، نظریۂ حیات ہے! اس لئے اسلام کی نشر و اشاعت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اپنے اس خیال کو اقبالؔ نے اپنی نظم "مکہ اور جینوا" میں واضح طور پر ظاہر کیا ہے ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

تلاشِ آدم

باری تعالیٰ نے آدم کی تخلیق کی، آدم زمانہ کی نیرنگیوں میں گم ہوگیا
آدمؑ ابھرا اور پھر فضاؤں میں کہیں کھوگیا ہے۔ اِسی آدم کی تلاش اقبالؒ کا
بنیادی مقصد ہے ؎

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار نہیں ہے

اور اس مقصد میں اقبالؒ تنہا نہیں ہیں۔ اقبالؒ کے ذہن اور روح کی پرواز ملاحظہ
ہو کہ اس کام میں خود خدا کی ذات پاک کو بھی شریک کرلیا ہے ؎

قدم در جستجوئے آدم زن
خدا ہم در تلاش آدمی است

آخر یہ آدمی کون ہے اور کہاں ہے؟ جس کی تلاش میں خود خدا سرگرداں و
حیراں ہے۔ اقبالؒ نے اس سوال کا جواب اپنی دو نظموں "فرشتے آدم کو
جنت سے رخصت کرتے ہیں" اور "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"
میں واضح طور پر دیا ہے "وہ حضرت انسان" جنھیں عرف عام میں آدمی پکارا
جاتا ہے اور جنھیں فرشتے رخصت اور روح ارضی جن کا استقبال کرتی ہے
ان کا ارشادیہ مختصر لیکن بلیغ انداز میں اُن کی آخری نظم میں ملتا ہے۔ پوری کی
پوری نظم یہاں نقل کرتا ہوں۔ نظم بے حد مختصر ہے، لیکن حاصل کلام ہے ؎

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات

٥

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

اقبال کہتا ہے کہ خدائی خودی میں گم ہے۔ اگر انسان خدا کا متلاشی ہے اسے خودی میں اسکی تلاش کرنی چاہیئے اور پھر ؎

بے ذوقِ نمود زندگی موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

حضرت انسان کا مرتبہ و مقام بڑا ہے۔ اتنا بڑا کہ وہ نائب خدا ہے ؎

برتر از گردوں مقامِ آدم است

اس لئے اقبال حضرت انسان کو ایک نئی دنیا کی تعمیر پر اکساتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جو ہر اعتبار سے رشکِ جنت بن جائے۔ جہاں انسان انسان کا بھائی ہو، اور ربطِ باہمی کے ذریعہ ایک نئی تہذیب کی تشکیل کر رہا ہو۔ ایک ایسی تہذیب جس کی بنیاد احترامِ آدم پر رکھی گئی ہو۔

اصل تہذیب احترامِ آدم است!
یہی حضرتِ انسان کی معراج ہے!!

کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی
یہ دنیا دعوت دیدار ہے فرزند آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی
یہی فرزند آدم ہے کہ رشک خوبیں سے
کیا ہے حضرت یزداں سے دریاؤں کو طوفانی
فلک کو کیا خبر یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے
غرض انجم سے ہے کس کی شبستاں کی نگہبانی
اگر مقصود کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
میرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے

مقصدِ کُل انسان ہے۔ اس سے بالاتر کوئی چیز نہیں، اور ہے تو صرف اور صرف خدا کی ذات ہے۔ اس لئے انسان کے ہر نئے ہنگامہ کی جو اس کی زندگی پر دلالت کرتا ہے کوئی انتہا نہیں ہے۔ اقبال نے اپنی نظم فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں، اور روح ارضی میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور پھر جن خیالات کو اقبال نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، ان تمام کو اختصار لیکن کمالِ حسن وفن کے ساتھ "حضرت انسان" میں پیش کیا ہے۔ فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے انسان تجھے روز و شب کی بے تابی عطا ہوئی ہے اور تجھے خود خبر نہیں ہوئی ہے کہ تو خاکی ہے یا سیمابی۔ گو تیری نمود خاک کی رہین منت ہے، لیکن تیری سرشت میں چاند تاروں کی آب و تاب اور ان کی بے چینی بھر دی گئی ہے۔ اور تو اتنا حسین ہے کہ خواب میں بھی اگر اپنا جمال دیکھے تو جھوم اٹھے گا وقت سحر تیرے گریہ اور آہ و زاری سے نخل کہن کی شادابی اور ترکی انوا سے

زندگی کا تجربہ بے پردہ ہو جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ قدرت نے تیرے ساز کو مانندِ مضراب بنایا ہے۔

انسان کے اندر یہ جو تخلیقی و روحانی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں اُن کے پیش نظر روحِ ارضی مچل جاتی ہے جب آدم آسمان سے اُٹھ کر زمین کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس نو واردِ گلستاں کو دعوتِ نظارہ بھی دیتی ہے اور دعوتِ عمل بھی۔ اصل میں یہ پوری نظم حضرت انسان کا لائحہ عمل ہے جس کی مکمل پابندی کے بغیر نہ تو خالق کا مقصد پورا ہوتا ہے نہ مخلوق کا۔ اور تخلیق آدم کا یہ کارنامہ بیکار محض تو نہیں ہے!؟ یہ زمین یہ آسمان، مشرق سے ابھرتا ہوا سورج، ایام جدائی، وصل کی کیفیت، بے تابی، معرکہ بیم و رجا، یہ گھٹائیں، یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں، یہ کوہ و صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں، مختصر یہ پوری کائنات آخر کس کے لئے؟ روحِ ارضی کہتی ہے کہ یہ سب تیرے لئے ہے اور یہ سب تیرے منتظر ہیں۔ تو آئے گا تو ان کا مقدر جاگ اُٹھے گا ؎

ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال حضرت انسان کو خودی کی تعلیم دیتے ہیں اور جد و جہد پر اُکساتے۔ کائنات میں انسان کی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے۔ اقبال کے مبصروں اور مفسروں نے اقبال کے مردِ مومن کی نشاندہی تو کی ہے۔ لیکن اس آدمی کی نہیں جس کی جستجو انہیں کوہ بہ کوہ، صحرا بہ صحرا لئے پھرتی ہے۔ اس آدمی کی خصوصیات کا اشارہ ہمیں ان اشعار میں ملتا ہے ؎

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے ۔ دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے ۔ پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیری خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

بچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے

تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے

ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

اقبالؔ نے حضرت انسان کو پیرِ صنم خانۂ اسرار، محنت کش، خونریز و کم آزار، اور جنسِ محبت کا خریدار بتایا ہے اور اسے تعمیرِ خودی اور کوششِ پیہم کی تلقین کی ہے خودی، حرکت و عمل اور عشق اقبالؔ کے دلچسپ موضوعات ہیں، اور اُن کی تشریح سے کلام اقبالؔ کی عبارت ہے۔ ماہرین اقبالیات نے ان موضوعات پر کھل کر بحث کی ہے۔ اس سے ان کی مراد اقبالؔ کے کلام کی تشریح کے ساتھ ساتھ قاری پر کلام کی اہمیت و مقصد کو واضح کرنا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں ایک ایسے انسان، یا انسانوں کے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل یا پھر یہ کہ تمام انسانوں کو اُن کے حقیقی روپ میں تبدیل کرنا ہے جو اپنی تخلیق کے موقع پر تھا اور جو ابلیس کے لئے بھی قابلِ تعظیم تھا۔ قرآن حکیم نے اس عظیم آدم کی تعریف کرتے ہوئے اُسے اپنا جانشین بنایا تھا۔ اور جس کے دل کو اپنا مامن و مخزن بتاتے ہوئے اپنی ذات کا پرتو قرار دیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبالؔ کے اس شعر کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے ؎

اگر مقصودِ کُل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے

مرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے

انسان کا جذبۂ عشق لا فانی ہے، اور انسان اسی جذبۂ عشق کی مدد سے لا فانی زندگی کا مالک بن جاتا ہے۔ اس کے ہنگامہ ہائے نو بنو کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ علم نے انسان کو فضیلت عطا کی اور عشق نے اسے لا فانی بنا دیا۔ اور ان دو عطائے کی وجہ سے انسان بندۂ مولا صفات کہلایا۔ اس طرح علم بغیر عشق انسان کے معیار پر بھی قرار پائے۔ جس طرح عشق بغیر علم شیطانیت ہے اسی طرح علم بغیر عشق ابلیسیت ہے۔ اقبال کی دلی آرزو یہی ہے کہ وہ انسان کو انسان ہی کے روپ میں دیکھیں، اور جب یہ انسان کہیں نظر نہیں آتا تو وہ اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ وہ ماضی کی تاریکیوں میں ڈھونڈتے ہیں وہ حال کے جال میں ٹٹولتے ہیں اور مستقبل سے پُر امید۔ اپنے کھوئے ہوؤں کی مستقبل میں تلاش و تخلیق کرتے ہیں۔

اقبال کی شاعری میں عقل و عشق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اکثر ناقدین اقبال نے کلام کی روشنی میں عقل کو کمتر درجہ عطا کیا ہے۔ حالانکہ منشار کبھی بھی یہ نہیں رہا کہ وہ عقل کی اہمیت و افادیت سے انکار کریں۔ البتہ انہوں نے "کبھی کبھی" عقل کو پیچھے چھوڑنے کی بات کی ہے۔ اس لئے کہ جذبات کے بہاؤ کے بغیر انسانی کشتی منزلِ مقصود کو نہیں پہنچ سکتی۔ وہ اپنے مقاصد میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن منزل کا شعور عقل ہی کا رہین منت ہوتا ہے۔ بھلا ایسی صورت میں اقبال عقل کی اہمیت کا انکار کر کے اپنی کم عقلی کا ثبوت کیوں دینے چلے؟ عقل خضر کا کام انجام دیتی ہے۔ جب کہ عشق انسانوں کو موجوں سے ٹکرانے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ یہ ایک قوت ہے جو انسان کو طاقت اور توانائی عطا کرتی ہے۔ اشفاق حسین[۱] نے اس نکتہ کو کچھ اسطرح واضح کیا ہے"۔ انسان کی شخصیت کی تعمیر و تزئین کیلئے حسن جسم و جان کی رفاقت ضروری ہے کہ ظاہر کا

۱: اقبال اور انسان

اثر باطن پر اور باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے (اقبالؔ کی زبان میں جسم اور روح کی ایک سیرت ہے) اسی طرح عقل اور عشق زندگی کے ارتقاء میں ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ حلیف ہیں۔ عشق کی خاصیت تخلیق ہے، اور علم کی تحقیق، عشق کائنات کی تسخیر کرتا ہے اور علم کی بدولت ہم ساری کائنات کی تفسیر و تشریح کرسکتے ہیں اور انسانوں کی تقدیر اس علم کی تدبیر سے وابستہ ہے ؎

چشم اُو بر وارداتِ کائنات
تا بہ بیند محکماتِ کائنات

علم کی بدولت ہم واردات سے آگاہ ہوسکتے ہیں اور جزیات سے کلیات بنا سکتے اور قوانین قدرت سے واقف ہوسکتے ہیں۔ اگر علم اپنے آپ کو اعلیٰ مقاصد کے تابع رکھے تو وہ خیر ہے ورنہ شر بن جاتا ہے۔ بے سوز دل یعنی عشق کی رفاقت و رہنمائی کے بغیر وہ تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے ؎

علم را مقصود اگر باشد نظر می شود ہم جادہ و ہم راہبر

اقبالؔ نے یہ جو عقل و عشق کا معرکہ کھڑا کیا ہے۔ اس کا تجزیہ دو مختلف انداز سے کرنا چاہیئے۔ انسان کی تخلیق کا منشاء عبادت نہیں ہے، تصرف ہے۔ اور محض تصرف نہیں، عبادت بھی ہے۔ ایک طرف تو خدا ہے۔ اور دوسری طرف کائنات ہے۔ کائنات کا وسیع تر ہے پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ خدا ظاہر نہیں، عام انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ لیکن وہ ہے ضرور، اور ساری کائنات پر محیط ہے، وہ انسان پر بھی متصرف ہے۔ اس حد تک انسان کائنات کی طرح مخلوق ہی ہے۔ لیکن انسان کی عظمت یوں ہے کہ وہ خالق کا منکر بھی ہوسکتا ہے۔ انکار کی یہ قوت انسان کو دیگر مخلوقات سے ممیز کرتی ہے ابلیس نے کہا تھا ؎

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بُو
کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسماں تو بتو

آج انسان عقل و علم کے بل بوتے پر اس مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں وہ بھی ابلیس ہی کی طرح اپنے مشیروں سے یہی انداز گفتگو اختیار کر سکتا ہے اور کرتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسان خدا سے دور ہو جاتا ہے اور یہی وہ منزل ہے جہاں عشق انسان کی عقل کیلئے خضرِ راہ کا کام انجام دیتا ہے۔

اقبالؔ کا عشق دو صورتوں میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ عشق ایک قوت ہے جو انسان کو اپنی منزل سے ہمکنار کرتا ہے۔ عشق تماشائے ذات ذات ہے اور حیات و حمات بھی۔ عشق مکاں و مکیں ہے اور زماں اور زمین بھی اور عشق سراپا یقین ہے اور یقین فتح یاب بھی، مختصر یہ کہ ؎

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات

عشق کے اس تصوّر کے بغیر کائنات کی تسخیر ممکن نہیں۔ عشق زندہ انسانوں کی طرح زندہ قوموں کا سرمایہ حیات ہوتا ہے۔ اس انداز سے مشرق و مغرب کی اُن قوموں کی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے جنہوں نے علم و عشق کے توازن سے تسخیر مہر و مہ کا فرض انجام دیا ہے اور دے رہے ہیں۔ اقبال کو اس بات کا دکھ ہے کہ مسلمان جو تسخیر کائنات کے اِس راز سے سب سے پہلے واقف ہوا، وہ علم اور عشق —— اِن دونوں نعمتوں سے محروم ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اُس پر حرام

مسلمانوں کے نزدیک عشق کا تصوّر بڑا ہی مجہول اور مضمحل ہے۔ یہ برسوں کی بے عملی اور گھٹیا قسم کے تصوف کا نتیجہ ہے۔ اقبالؔ مسلمان کو اِس

جمود سے نکالنا چاہتے ہیں، اور اُن کے سامنے حرکت، عمل اور عشق کا تصور پیش کرتے ہیں۔ یہہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔

عشق قوت و طاقت ہونے کے علاوہ ام الکتاب بھی ہے۔ اسی وجہہ سے یہ عشق مصطفوی بھی ہے۔ علم نے انسان کو انکار کی قوت عطا کر دی ہے وہ اپنے عقل پر اتنا کچھ نازاں اور فرحاں ہے کہ خدا کا وجود اسے محض بیکار سا لگتا ہے، اور اکثر تو اسکے وجود ہی سے انکار کرتا ہے۔ یہاں عشق اسکی رہبری کرتا ہے اور اس میں اقرار کی قوت پیدا کرتا ہے۔ وہ انسان کو خدا سے قریب تر کرتا ہے۔ وہ کائنات اور خالق کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے۔ انسان کی حیثیت دُہری ہے۔ ایک طرف کائنات ہے تو دوسری طرف کائنات اور خود اس کا پیدا کرنے والا خدائے واحد ہے۔ اس حیثیت سے اس کے فرائض بھی مختلف ہیں۔ وہ خدا کا تابع ہے۔ کائنات اس کی تابع ہے۔ وہ اختیار نہیں رکھتا، اور وہ مختار بھی ہے۔ جہاں اسے اختیار حاصل ہے وہاں عقل جسکی وجہہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلایا اس کی مدد کرتی ہے اور عشق اس کی قوت و طاقت بن جاتا ہے اور جہاں وہ بے اختیار ہے عقل وہاں ابلیس کے انجام کو پیش کر دیتی ہے۔ یہاں عشق یہاں بھی ایک قوت بن کر خدا سے اس کے رشتہ کو مضبوط تر بنا دیتا ہے۔ یہاں عشق بے حد لطیف ہے۔ روح انسانی کی طرح جس انسان کے نزدیک عقل و عشق ہم رکاب ہو جاتے ہیں، تو اُسے صاحب نظر بنا دیتے ہیں اور یہی انسان کی معراج بھی ہے ؎

از جلالِ بے جمالے الاماں

از فراقِ بے وصالے الاماں

اقبالؔ بھی اس جلال سے پناہ مانگتے ہیں۔ جس میں جمال کی کیفیت موجود

نہیں ہے اور اس فراق سے بھی جسمیں وصال کی چاہ نہیں ہے ۔ ابلیس راندۂ درگاہ ہے اور آدم بھی جرم کی پاداش میں جنت سے نکالا گیا ۔ لیکن ابلیس آدم میں بنیادی فرق بھی ہے ۔ ابلیس اپنے علم کے زعم میں انکار ہی انکار کرتا ہے جبکہ آدم اس فراق کے باوجود وصل کی چاہت میں غلطاں و حیراں ہے ۔
حلاج کی زبانی اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

کم بگو آں خواجۂ اہل فراق
تشنہ کام و از ازل خونیں ایاق

ابلیس محروم ازلی ہے جبکہ آدم وصال کے لئے تڑپ رہا ہے ۔ صوفیا کا مسلک یہی ہے کہ وہ روحانی قوت کے ذریعہ قرب الٰہی حاصل کر لیتے ہیں ۔ رومی نے کہا ؎

ما ز فلک برتریم و ز ملک افزوں تریم
زیں دو چرا نگذریم منزل ما کبریاست

انسان آسمان سے برتر اور فرشتوں سے بلند تر ہے ۔ وہ ان دونوں سے آگے بڑھنا چاہتا ہے کہ اس کی منزل مقام کبریا ہے ۔ اقبال نے بھی کہا ہے ؎

شعلہ درگیر زد برخس و خاشاکِ من
مرشدِ رومی کہ گفت منزل ما کبریاست

اشفاق حسین رومی اور اقبال کے ان اشعار کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ "یزداں بہ کمند آور" کا یہی مطلب ہے ۔ یزداں کو آغوش میں لینے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان زمان و مکاں پر غالب آجائے ۔ انسان قربِ خداوندی سے اپنے اندر خدائی صفات کا عکس پیدا کر سکتا ہے "۔ جہاں تسخیر کائنات انسان کا بنیادی مقصد ہے وہیں قرب خداوندی کا حصول بھی اس کے لئے لازمی اور ضروری ہے ، اور جس طرح انسان علم کی روشنی میں عشق کی قوت سے فائدہ اٹھا کر

تسخیر کا فرض انجام دیتا ہے۔ اسی طرح انسان علم کی بنیاد پر عشق کی مدد سے قربِ الٰہی حاصل کر لیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ معرفت کا حصول جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ اور جو لوگ جدوجہد کرتے ہیں تبارک و تعالیٰ انہیں راہیں دکھا دیتا ہے۔ اس کوشش میں انسان کیلئے علم یا عقل نہیں عشق کلیدی رول ادا کرتا ہے ؎

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

اقبالؔ انسانیت کو قربِ الٰہی کا درس دیتے ہیں یا کہتے ہیں ؎

بس اتنی سی حقیقت ہے ہمارے دین و ایمان کی
کہ اس جانِ جہاں کا آدمی دیوانہ ہو جائے

تو ان سے یہی مراد ہے کہ انسان محبت الٰہی اور عشق رسول کے ذریعہ اپنے اندر انسانی اقدار کو فروغ پانے کا موقع دیتا ہے۔ اقبالؔ نے کسی عصبیت یا تنگ نظری کی وجہ سے اپنی شاعری کے ذریعہ اسلام کی وکالت نہیں کی ہے۔ وہ رازِ درونِ میخانہ کا محرم ہے۔ وہ اس حقیقت سے خوب خوب واقف ہے کہ موجودہ دنیا جو حرص و ہوس کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ اسلامی قدروں کی ترویج کے بغیر جنت نشان نہیں بن سکتی۔ اور عالمی امن جو آج کے انسان کا سب سے بڑا مدعا ہے حاصل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ محمد عربیؐ کی تعلیمات کو نہ اپنا لے۔ محمد عربیؐ اقبالؔ کے مردِ مومن ہیں۔ مکمل نمونہ۔ اقبالؔ کی ساری شاعری اسی مردِ مومن کے گرد گھومتی ہے۔ پیغمبرِ اسلام کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انسان کو انسان سے قریب تر کر دیا۔ اور انسانی تہذیب کی بنیاد احترامِ آدم ہی کو قرار دیا ؎

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

موجودہ انسان کا المیہ یہ نہیں ہے کہ انسانی اقدار سے تہی دامن ہے۔ المیہ تو یہ ہے کہ وہ ان اقداروں کی محرومی کے احساس سے بھی نابلد ہے۔ جس دن انسان اپنی اس محرومی سے آگاہ ہو جائے گا تو وہ انسان کا روشن تر دن ہوگا انسان خود کی تلاش میں نکل پڑے گا، اور بالآخر اس منزل کو پا ہی لیگا جس منزل کی نشاندہی محمد عربیؐ نے کی ہے۔ کلام اقبالؒ کو بھی اور کلام الٰہی کو کسی عصبیت کی عینک سے نہیں اسی وسیع تر پس منظر میں پڑھنا اور سمجھنا ہوگا ؎

مری اسیری پہ شاخ گل نے یہ کہہ کے صیاد رلایا
کہ ایسے پرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ